علامہ راشد الخیری
شخصیت اور ادبی خدمات
نجم السحر اعظمی

علامہ راشد الخیری

شخصیت اور ادبی خدمات

نجم السحر اعظمی

پہلا ایڈیشن ________ اکتوبر ۲۰۰۰ئہ
تعداد ________ ایک ہزار
مطبوعہ ________ کلمر پریس ، دہلی
قیمت ________ ایک سو پچاس روپے Rs. 150/
کتابت ________ رئیس الاسلام ، نئی دہلی
بہ اہتمام ________ ڈاکٹر خوشحال زیدی
ناشر ________ ادارہ بزم خضر راہ
۸۰- انتظار لاج ، غفار منزل
جامعہ نگر ، نئی دہلی ۲۵

تقسیم کار: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس ، گولہ مارکیٹ ، دریا گنج ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
ایجوکیشنل بک ہاؤس ، گلی وکیل والی ، کوچہ پنڈت ، لال کنواں ، دہلی ۱۱۰۰۰۶
آہلو والیہ بک ڈپو ، نیو روہتک روڈ ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۵
کتب خانہ انجمن ترقی اردو ، جامع مسجد ، اردو بازار ، دہلی ۱۱۰۰۰۶
بھوپال بک ہاؤس ، بدھوارہ ، بھوپال (ایم پی)
شاخ ادارہ بزمِ خضرِ راہ ۱۲/۵۴۷ ، گوال ٹولی ، کانپور (یوپی)

"ALLAMA RASHID UL KHAIRI
SHAKHSIAT AUR ADABI KHIDMAAT"
BY
NAJMUS-SAHER AAZMI
Rs. 150/=

انتساب

میرے پیارے ابّو منظر اعظمی

اور پیاری امّی ماجدہ رضیہ منظر

کے نام

کہ جن کے فیض سے میری نگاہ ھے روشن

نجم السحر

فہرست مضامین

حرفے چند

یہ مقالہ راشد الخیری کی سوانح اور ادبی خدمات کے تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے۔
غدر کے بعد جب ہندوستان کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور تعلیمی زندگی میں ایک زبردست تبدیلی رونما ہوئی تو اس وقت ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ نہ صرف جدید تعلیم کے حصول کا تھا، بلکہ تعلیم سے عام بیزاری کو بھی دور کرنا تھا۔ اس وقت سرسید نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانے کا بیڑہ اٹھایا۔ اور تعلیم کی توسیع و اشاعت کے لئے جامع منصوبے تیار کئے اور ان منصوبوں نے ملک کی تعلیمی اور اصلاحی تحریکات میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ لیکن بدقسمتی سے ان ساری کوششوں کے پیچھے تعلیم نسواں کی گنجائش یا تو بہت کم تھی یا سرے سے تھی ہی نہیں۔ عورتوں کی اکثریت نہ صرف جاہل تھی، بلکہ وہ فرسودہ خیالات و عقائد اور غلط رسم و رواج کی بیڑیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ چنانچہ سرسید کے رفقا میں سب سے پہلے مولوی نذیر احمد نے ......
.... تعلیم نسواں کی اہمیت اور ضرورت کو محسوس کیا اور اس کی اشاعت کا بیڑہ اٹھایا۔ اور ان کے بعد حالی، سرشار، شرر، رسوا اور پریم چند اور تقریباً تمام مصنفین نے اپنی تصنیفات کے ذریعے نہ صرف تعلیم نسواں کی ترغیب دی بلکہ عورتوں کے اندر صدیوں سے جاری سماجی و معاشرتی خامیوں کو بھی دور کرنے کی کوشش کی۔

لیکن اردو ناول کی تاریخ میں علامہ راشد الخیری صحیح معنوں میں نذیر احمد کے جانشین تھے۔ انھوں نے اپنی بیشتر تصانیف میں طبقۂ نسواں کے مسائل اور ان کی ذہنی کشمکش اور الجھنوں کو اپنا موضوع بنایا۔ ان کے فن، کارنامے اور اردو ادب پر اس کارنامے کے مجموعی اثرات کا جائزہ اور مطالعہ ہر لحاظ سے توجہ کے قابل ہے۔ انھوں نے

اس موضوع پر غالباً اردو میں سب سے زیادہ ناول اور افسانے لکھے ہیں۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب راشد الخیری کے ناول اور ان کی بہت سی تحریریں مختلف سطحوں پر اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل تھیں۔ آزادی سے پہلے ہر سال دو سال کے بعد ان کی بعض کتابوں کے نئے ایڈیشن شائع ہوتے گئے۔ مگر آزادی کے بعد یہ سلسلہ بند ہو گیا۔ اس لئے نئی نسل راشد الخیری کے صرف نام سے واقف ہے۔ اس نسل نے راشد الخیری جیسے صاحبِ طرز اور صاحبِ اسلوب کی تحریریں بہت کم پڑھی ہیں یا بالکل نہیں پڑھیں۔ یہ بد نصیبی راشد الخیری کی نہیں، ہماری ہے کہ ہم اپنے عظیم ادبی اور تہذیبی سرمائے سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کی تصانیف دہلوی نثر کا بہترین نمونہ ہیں اور دہلی کے سماجی اور تاریخی واقعات کا اہم ماخذ ہیں۔ ان کی خدمات کو اردو ادب کی تاریخ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر راشد الخیری کو اپنے مقالے کا موضوع بنایا ہے اور اس ضمن میں میری پوری کوشش یہ ہے کہ اس مقالے کے واسطے سے اردو کے ممتاز ادیب اور محسنِ نسواں کی خدمات اور حالات کی پوری روداد سامنے آجائے۔

یہ مقالہ میں نے اپنی نگراں استاد پروفیسر صغرا مہدی کی رہنمائی میں مکمل کیا ہے۔ وہ قدم قدم پر میری رہنمائی کرتی رہیں۔ صحیح اور بر وقت مشورے اور صلاح دیتی رہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی اور مشورے ہی اس مقالے کی ترتیب کے ضامن ہیں۔ میں دل کی عمیق گہرائیوں سے ان کی شکر گزار ہوں۔

میں صدر شعبہ پروفیسر عبید الرحمٰن ہاشمی، پروفیسر عنوان چشتی اور پروفیسر حنیف کیفی صاحب کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے ہر طرح سے میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ محترم پروفیسر شمیم حنفی صاحب کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا فرض ہے جنھوں نے بڑے مشفقانہ انداز میں میری حوصلہ افزائی فرمائی اور مواد کی فراہمی میں میری بہت معاونت کی اور انہیں کے مشورے پر میں نے اس موضوع کا انتخاب بھی کیا تھا۔ میں ان کی بے حد ممنون و مشکور ہوں۔

میں اپنے پیارے ابّو پروفیسر جناب منظر اعظمی کی بے حد ممنون ہوں، جنہوں نے اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود ہر قدم پر میری راہ نمائی کی۔ اس مقالے کی تکمیل اُن کی دُعاؤں کا ثمرہ ہے۔

میں اپنے شوہر جناب علیم حنفی صاحب کی تہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کام کے لئے ہر طرح سے میری حوصلہ افزائی کی۔

آخر میں، میں محسنِ اُردو ڈاکٹر خوشحال زیدی، مینیجنگ ڈائریکٹر بزمِ خضرِ راہ، نئی دہلی کی شکر گزار ہوں، جن کی کوششوں اور ذاتی دلچسپی کے سبب یہ کتاب منظرِ عام پر آئی۔

نجم السحر

نومبر ۱۹۹۷ء۔ نئی دہلی

پروفیسر شمیم حنفی

پیش لفظ

ہماری اجتماعی تاریخ کے واسطے سے اُنیسویں صدی ایک نئی تہذیبی نشاۃ ثانیہ اور ہمہ گیر اصلاحات کی صدی تھی۔ فکشن کے بارے میں اس طرح کے تصورات کہ وہ بہر حال زمان و مکان کے ایک دائرے کا پابند ہوتا ہے یا یہ کہ شاعری کے برعکس فکشن کی دنیا ایک واضح طبعی اور مادّی پس منظر رکھتی ہے، بہت دیر کے عام ہوئے۔ مگر اس قسم کے تصورات کے شعور شروع سے ہی اردو فکشن کی روایت کا اہم رکاب رہا۔ وہ تمام لکھنے والے جنہوں نے فکشن کی نئی صنفوں کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا، گہری سماجی اور معاشرتی بصیرت رکھنے والے لوگ تھے۔ اُنہیں ادب کے ساتھ ساتھ اپنی اجتماعی ذمّہ داریوں کی ادائیگی کا احساس بھی تھا۔ نذیر احمد، سرشار، شرر، رُسوا، راشد الخیری اور اُس عہد کے تمام چھوٹے بڑے لکھنے والوں کے یہاں ذمّہ داری کا یہ احساس ملتا ہے۔

بہ ظاہر راشد الخیری ایک مٹتی ہوئی تہذیب اور بکھرتی ہوئی اجتماعی زندگی کے نوحہ گر دکھائی دیتے ہیں۔ مگر ان کی تحریریں، اردو ناول کی تاریخ سے قطع نظر دو اور حوالوں سے اہم اور لائق توجہ محسوس ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہوش رُبا تبدیلیوں کے دَور میں اُنہوں نے ماضی کے احساس کو برقرار رکھا اور اس سلسلے میں ایک مربوط اور منظم اخلاقی موقف میں ثابت قدم رہے۔ دوسرے یہ کہ اُنہیں ہند اسلامی تہذیب کے منتشر ہوتے ہوئے شیرازے اور اُس کے واقعاتی سیاق کا علم ہی نہیں، تجربہ بھی تھا۔ راشد الخیری کا مشاہدہ وسیع، اُن کا ادراک گہرا اور اُن کی بصیرت تیز تھی۔ علاوہ ازیں وہ اپنے مشاہدوں، تجربوں اور بصیرتوں کو قصّے کی زبان میں منتقل کرنے کا سلیقہ بھی بہت رکھتے تھے۔ ایک زمانے میں راشد الخیری کی مقبولیت کا حال یہ تھا کہ متوسط طبقے کے تقریباً تمام مسلم گھرانوں میں

اُن کی کتابیں شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ اردو فکشن کے کم لکھنے والوں کو قارئین کا اتنا بڑا حلقہ نصیب ہوا ہوگا۔

نجم السحر نے یہ مقالہ ایم فل کی طالبہ کے طور پر لکھا تھا۔ اُنہوں نے اپنے موضوع پر محنت بھی کی اور اپنی محنت کے نتائج کو مرتب کرنے میں احتیاط اور توازن کا سرا ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اسی لئے اُن کے ممتحنوں نے مقالے کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار بھی کیا اور راشد الخیری کے مطالعے میں اُسے ایک قابلِ قدر کوشش قرار دیا۔ مجھے خوشی ہے کہ ان کا مقالہ اب کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے اور اُمید ہے کہ پڑھنے والے اس کا خیر مقدم کریں گے۔

باب اوّل

پیدائش اور ادبی ماحول:

علّامہ راشد الخیری دلّی کے اس مقتدر اور ممتاز خاندان کے فرزندِ رشید تھے۔ جس کا سلسلۂ نسب رسولِ اکرمؐ کے جلیل القدر صحابی عکرمہ بن ابوجہل سے ملتا ہے اور جس کو خاندانِ مغلیہ کے اُستاد رہنے کا نسل در نسل فخر حاصل رہا ہے۔ یہ وہ خاندان تھا جس نے مولوی عبدالقادر مرحوم (دادا) مولوی عبدالخالق مرحوم (پردادا) اور مولوی عبدالرب (چھوٹے دادا) جیسے جیّد علماء اور قرآن و حدیث کے ماہرین پیدا کئے۔ علّامہ کے چھوٹے دادا عبدالرّب کئی کتابوں کے مصنّف تھے۔ "حواسِ خمسہ" اور "فردوسِ آسیہ" ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ اور اس خاندان کے داماد میاں نذیر حسین محدّث دہلوی اور ڈپٹی نذیر احمد جیسے اصحاب تھے۔

علّامہ کے والد حافظ عبدالواجد صاحب انگریزی میں ماہر تھے۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے جو منصف مقرر ہوئے۔ آپ کی والدہ رشید الزّمانی صاحبہ اردو کی شاعرہ تھیں۔[۱] علّامہ راشد الخیری کی پیدائش دہلی میں ۱۸۶۸ء میں ہوئی۔ عبدالقادر صاحب نے اپنے پوتے کا نام عبدالراشد رکھا اور صحیح معنوں میں علّامہ نے اپنی قوم کو ہدایت دینے کا حق ادا کیا۔[۲]

عبدالواجد اس خاندان کے پہلے شخص تھے جنھوں نے نہ صرف انگریزی سیکھی بلکہ اس میں غیر معمولی قابلیت حاصل کی اور کوٹ پتلون پہنی اور مغربی معاشرت بھی اختیار کی۔ لیکن باپ کی معاشرت اور خیالات کے برعکس راشد الخیری کی تربیت خالص مشرقی اور اسلامی اصولوں پر عبدالقادر جیسے جیّد عالم دادا کی نگرانی میں ہوئی۔ خدا کا خوف اور رسولؐ کی عظمت کا سبق اُنہوں نے گھر پڑھا۔ اور ایسا پڑھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے ذہن نشین ہو گیا۔

---

[۱] آپ کی والدہ کا نام فاطمہ بیگم تھا۔ رشید الزمانی سسرال میں اُنہیں لقب دیا گیا تھا۔ (بحوالہ: "عصمت" جولائی ۱۹۶۴ء ص ۶۲ [۲] بحوالہ عصمت جولائی ۱۹۶۴ء ص: ۶۲

علاّمہ نے سب سے پہلے قرآن شریف اپنی دادی سے پڑھا۔ اس کے بعد دلّی کے عربک اسکول میں داخل ہوئے۔ لیکن مدرسے میں انہیں سوائے انگریزی کے کسی مضمون سے دلچسپی نہیں تھی۔ اور اس مضمون میں ہمیشہ اپنی جماعت میں اوّل رہتے تھے اور اسی وجہ سے جماعت میں کبھی فیل نہیں ہوئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے خود ایک واقعہ اپنے بیٹے رازق الخیری کو سُنایا تھا کہ:

"میں ساتویں یا آٹھویں جماعت میں تھا کہ امتحان ہوا۔ ایک ہم جماعت تھے عبدالرشید، ان کا حساب بہت اچھا تھا۔ لیکن انگریزی بہت کمزور تھی اور انگریزی میں میرے ۱۰۰ میں سے ۸۰ نمبر تھے اور عبدالرشید کے سولہ مگر حساب میں میرے ۲۰ نمبر تھے اور اُس کے ۸۰۔ رومن میں عبدالرشید اور عبدالراشد ایک ہی طرح لکھتے ہیں۔ بے چارے عبدالرشید فیل ہو گئے اور میں اوّل آگیا۔"[1]

عربک اسکول میں علاّمہ نے بہت دل لگا کر نہیں پڑھا، مگر اُستادوں کا بے حد احترام ان کے دل میں تھا ان کے اسکول ہی کے زمانے میں پہلے دادا اور پھر باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے ان کا دل اسکول سے اُچاٹ ہو گیا۔ حالانکہ اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر خواجہ شہاب الدین انگریزی کے اُستاد مرزا احمد بیگ، مولانا الطاف حسین حالی جو اُردو اور فارسی کے اُستاد تھے۔ ان سب کو اپنے شاگرد سے کوئی شکایت نہیں تھی، مگر حساب کے استاد امتیاز حسین کو ان کے حساب میں کمزور ہونے کی شکایت تھی۔

خود فرماتے ہیں:

"دادا ابا بے چارے اس فکر میں گھُلے جاتے تھے کہ ابّی[2] دن بھر محنت سے پڑھتا ہے۔ ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوتی کہ ادھر حساب کا گھنٹہ بجا اور اُدھر مدرسہ کی نہر پر پہنچا اور تیراکی شروع کردی یا نیم کے درخت کے نیچے بیٹھ

---

[1] "عصمت" جولائی ۱۹۶۴ء ص ۶۶

[2] راشد الخیری کو گھر والے ابّی کہتے تھے۔ جب جوان ہوئے تو بھائی ابّی بوڑھے ہوئے ماموں ابّی یا چچا کہلائے۔

کر بانسری بجانے یا گانے لگا۔"[1]

مگر باپ اور دادا کی شفقت سے محروم ہونے کے بعد اُنہوں نے نویں جماعت میں اسکول جانا چھوڑ دیا اور اس کے بعد ان کے پھوپھا ڈپٹی نذیر احمد کی نگرانی میں ان کی تعلیم مکمل ہوئی۔ علامہ کو سیر و تفریح کا بہت شوق تھا اور موسیقی سے اُنہیں بہت دلچسپی تھی۔ اور بانسری بہت اچھی بجاتے تھے۔ کبڈی کے بہت اچھے کھلاڑی تھے اور کرکٹ بھی اچھا کھیلتے تھے۔ اُنہیں تیراکی کا بہت شوق تھا۔ پچیسی اور تاش تو اُس وقت ایک عام چیز تھی۔ گھر گھر میں کھیلی جاتی تھی۔ علامہ نے اپنے لڑکپن میں پتنگ بازی بھی کی اور اپنے چچا زاد بھائیوں کے ساتھ گلّی ڈنڈا بھی کھیلا۔ ان کا یہ سیر و تفریح کا شوق اور کھیلوں سے دلچسپی آخری عمر تک رہی۔

ان کے لڑکپن کے ساتھیوں میں مولوی اشرف حسین جو اِن کے پھوپھی زاد بھائی تھے اور عمر میں پانچ سال بڑے تھے، ان کی صحبت میں علامہ نے بہت کچھ سیکھا۔ اور ان کی بہت عزّت کرتے تھے۔ وہ علامہ کے بڑے بھائی بھی تھے اور دوست اور اُستاد بھی۔ قاری سرفراز حسین بھی ان کے بے تکلف دوست تھے۔ ان کے علاوہ شہزادہ مرزا محمد اشرف، چچا قطب الدین، عبدالمجید صاحب اور ڈاکٹر محمد عبدالجبّار ان کے بے تکلف دوستوں میں تھے۔

ماحول، شادی، ملازمت اور ابتدائی تخلیق:

راشد الخیری اپنے خاندان کے بڑے بیٹے کے پہلے پوتے تھے۔ اس لئے ددھیال و ننھیال میں سب کو ان سے بے حد محبت تھی۔ دادا دادی اور پھوپھیوں کی آنکھ کے تارے تھے۔ دادا کے جگر کی ٹھنڈک تھے۔ آخری عمر میں دادا کی آنکھیں جاتی رہی تھیں، لیکن وہ خود مدرسے چھوڑنے اور لینے جاتے تھے۔ مگر باپ کے بعد جب دادا کی شفقت سے بھی محروم ہو گئے تو مدرسے سے دل اُچاٹ ہو گیا۔ نویں جماعت میں تھے کہ اسکول جانا بند کر دیا اور گھر پر رہنے لگے۔ سارا دن چھت پر گاتے، تاش کھیلتے، پتنگ

---

[1] "عصمت" جولائی ۱۹۶۴ء ص ۶۷

اُڑاتے اور باہر نکلنے کا موقع ملتا تو شام کو کرکٹ کھیلتے۔ راشد الخیری کے چچا خان بہادر عبدالحامد ڈپٹی کلکٹر جن کی سرپرستی میں راشد الخیری باپ اور دادا کے انتقال کے بعد تعلیم حاصل کر رہے تھے، اس وقت اُناؤ میں تھے جب علامہ نے اسکول جانا بند کر دیا اور سارا دن کھیل تماشوں میں بتانے لگے۔ ان کی خالائیں، ماموں، پھوپھیاں اور سب سے بڑھ کر دادی اور ماں سخت پریشان تھیں کہ کیا علاج کیا جائے کہ ابی میاں کا پڑھنے میں دل لگے۔ اتفاق سے کچھ روز بعد ان کے پھوپھا ڈپٹی نذیر احمد حیدر آباد (دکن) سے آئے تو ان کی دادی نے کہا:

"ابی میاں نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ میں تمہارے سپرد کرتی ہوں، انہیں پڑھاؤ۔ داماد نے کہا کیا پڑھاؤں۔ اُنہوں نے جواب دیا حدیثیں پڑھاؤ۔ قرآن شریف کا ترجمہ پڑھاؤ تاکہ یہ اپنے دادا پردادا کی طرح مولوی بنے۔ قرآن اچھا پڑھتا ہے آواز بھی اچھی ہے۔ اپنے باپ کی طرح وہ حافظ ہے اسے قاری بناؤ۔ مولوی بنے یا قاری کچھ تو بناؤ۔ باپ دادا کے نام کو بٹہ تو نہ لگے۔" [۱]

لہٰذا ان کے پھوپھا ڈپٹی نذیر احمد کی نگرانی میں ان کی تعلیم شروع ہوئی۔ نذیر احمد علامہ کو کوئی کتاب دے دیتے اور کہتے اس کو پڑھو اور مجھے بتاؤ کہ کیا پڑھا۔ دوسرے دن جگہ جگہ سے پوچھتے۔ علامہ کچھ پڑھتے تو صحیح جواب دیتے۔ بغیر پڑھے اناپ شناپ جواب دے دیتے۔ جواب سُن کر نذیر احمد کتاب پھینک دیتے اور خفا ہوتے۔ پھر دھیرے دھیرے صحیح جواب دینے لگے تو کہا اب مضمون لکھو۔ کتاب اپنے سامنے رکھو اور اپنے الفاظ میں یہی بات لکھو۔ وہ غلط سلط لکھ کر لاتے تو نذیر احمد بغیر پڑھے پھینک دیتے۔ علامہ کا بیان ہے کہ:

"کئی دن یہ ہوتا رہا۔ ایک دن جی کڑا کر کے میں نے کہا۔ آپ پڑھتے تو ہیں نہیں پھینک دیتے ہیں۔ پڑھئے تو سہی اور اصلاح کیجئے۔ پھوپھا نے جواب دیا کیا خاک اصلاح کروں۔ تمہاری اصلاح ہو جائے تو اس

---

[۱] "عصمت" راشد الخیری نمبر ۱۹۶۴ء ص ۷۲

مضمون کی بھی ہو جائے گی ۔ آخر انہوں نے ایک مضمون کا کچھ حصہ لکھا ۔ اور کہا کہ لو اب اس کو مکمل کرو ۔ میں نے بہت محنت سے دو صفحے لکھ کر انہیں دکھائے ۔ انہوں نے سات آٹھ سطریں پڑھنے کے بعد نظر اٹھا کر مجھے دیکھا اور کہا شاباش ! آج میں تم سے بہت خوش ہوں ۔ تم محنت کرو تو مضمون لکھ سکتے ہو"۔ ؎

ڈپٹی نذیر احمد کی چھٹیاں ختم ہوئیں تو وہ حیدر آباد واپس چلے گئے ۔ مگر جانے سے پہلے انہوں نے اپنے چھوٹے سالے خان بہادر عبدالحامد کو اُرئی سے خط لکھا کہ ابّی کی نگرانی کرنے والا کوئی نہیں ہے اسے اپنے پاس بلا لو ۔ چنانچہ راشد الخیری اپنے چچا کے پاس کچھ دن اُورئی میں رہے ۔ جہاں انہوں نے ان کا داخلہ گورنمنٹ ہائی اسکول میں کرا دیا ۔ مگر مدرسہ میں اب ان کا دل لگنا مشکل تھا ۔ البتہ اردو انگریزی کی کتابوں کا خود ہی مطالعہ کرتے رہے ۔ چچا کا تبادلہ اُورئی سے اُناؤ ہوا تو ان کے ساتھ اُناؤ چلے گئے ۔

تکمیلِ تعلیم کے بعد مولوی عبدالرحیم مرحوم بانی جامع مسجد جھجھر کی اکلوتی بیٹی محترمہ فاطمہ بیگم سے جنوری ۱۸۹۰ء میں شادی ہوئی ۔ اور ۱۸۹۱ء میں محکمہ بندوبست اُناؤ میں جہاں ان کے چچا ڈپٹی کلکٹر تھے ، کلرک کی حیثیت سے نوکری مل گئی ۔ مگر ملازمت کی پابندی علامہ کی طبیعت کے خلاف تھی اور دفتر کے خشک کاموں میں ان کا جی نہیں لگتا تھا ۔ اور پھر ان کی والدہ اپنے اکلوتے بیٹے کی جدائی سے مغموم تھیں اور وہ ان کی جدائی زیادہ دن برداشت نہیں کر سکتی تھیں ۔ ان وجوہ سے جم کر ایک جگہ نوکری نہیں کر سکے اور ترقی کے نہایت معقول مواقع میسر آنے پر بھی ان کی توجہ نہیں کی ۔ اور اُناؤ ، مین پوری ، علی گڑھ اور دہرہ دون میں تبدیلی ہوتی رہی ۔ اور آخر دلی کے پوسٹل آڈٹ آفس میں تبادلہ ہوا ۔ مگر چند سال بعد ہی ۱۹۱۰ء میں ۱۸ ، ۱۹ سال کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ۔ ان کی آخری ملازمت کے بارے میں مُلّا واحدی صاحب لکھتے ہیں :

"مولانا ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف کے دفتر میں سب ایڈیٹر

؎ دیباچہ منازل السائرہ ۱۹۷۶ء ص ۶

تھے۔ دو اور دو چار اور چار اور چار آٹھ گننے سے انہیں مطلق مناسبت
نہیں تھی۔ بالآخر انہوں نے ملازمت چھوڑ دی"۔ [۱]

کیوں کہ اس دوران ان کی دو کتابیں صالحات اور منازل السائرہ شائع ہو چکی تھیں اور ان
کی اس قدر شہرت تھی کہ ان کے اعلیٰ افسر نے ایک موقع پر کہا کہ :

"HE HAS LATELY TURNED HIS HAND TOWARDS NOVEL WRITING AND BIDS US FAREWELL TO ACHIEVE DISTINCTION AS A WRITER OF URDU FICTION" 2

اردو ترجمہ :

"اُس نے دیر سے اپنا ہاتھ اُردو ناول نویسی کی طرف موڑ لیا ہے اور ہم سے
بطور ایک اُردو ناول نگار نمایاں حیثیت حاصل کرنے کے لئے رخصت
ہو رہا ہے"۔ [۲]

وہ عموماً دفتر کے کمرے میں تنہا بیٹھ کر اپنے خیالوں میں منہمک ہو جاتے کہ چپراسی اور کلرک
کو بھی خبر نہ ہوتی۔ علامہ مغفور کے ذاتی اوصاف میں ایک بڑی چیز خودداری تھی، جسے
انہوں نے ملازمت میں بھی ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔ اور کبھی بھی افسران کے گرد چکر نہیں لگائے۔
نتیجتاً ان کے تبادلے مختلف مقامات پر ہوتے رہے۔ مین پوری میں ان کا تبادلہ اس تبصرے
کے ساتھ ہوا کہ :

"اس شخص کی چھٹیوں کے دن کام کے دنوں سے زیادہ ہیں"۔ [۳]

اور آخر میں ان کا تبادلہ دلّی میں ہوا۔ جہاں علامہ نے رسالہ "عصمت" جاری کیا۔ چونکہ وہ
سرکاری ملازم تھے، اس لئے پبلشر کی حیثیت سے ان کا نام رسالے میں نہیں چھپ سکتا تھا۔
چنانچہ ۱۹۱۰ء میں انہوں نے ملازمت چھوڑ دی۔

۱۔ "عصمت" جوبلی نمبر ۱۹۶۴ء ص ۹۵

۲۔ " " " ۹۶

۳۔ " " " ۹۶

ادبی تخلیق کی ابتدا:

راشد الخیری میں ادبی ذوق اپنے پھوپھی زاد بھائی اشرف حسین کی صحبت میں پیدا ہوا۔ اور پھر مولانا حالی اور ڈپٹی نذیر احمد کی شاگردی نے اُسے جلا بخشی۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع اور مشاہدہ بہت تیز تھا اور حافظہ بھی غضب کا تھا۔ اُنہوں نے مدرسے کی تعلیم سے نہیں، ذاتی مطالعے سے بہت ترقی کی۔

نذیر احمد ان کے متعلق لکھتے ہیں:

"مولوی عبدالراشد مولویوں کے خاندان کے ایک ممتاز ممبر ہیں۔ جو اُن کی تعلیم کا زمانہ تھا تعصب اس وقت مذہبی مسلمانوں میں اس قدر تھا کہ مولوی عبدالراشد جیسے خیالات کا آدمی مسلمانوں کی سوسائٹی میں نہیں رہ سکتا۔ ان میں ہمیں اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ترقی کا مادہ فطرتاً ہر شخص میں موجود ہے۔ اُنہوں نے جو کچھ سیکھا اپنے سے سیکھا۔ اس نسل میں انہیں نادر (؟) میں ان کے خیالات اور Self Study کے لحاظ سے سب سے ممتاز رکھتا ہوں۔"[1]

راشد الخیری کی سب سے پہلی تصنیف جو شائع ہوئی وہ "صالحات" ہے۔ اس کے بعد اُنہوں نے ۱۸۹۰ء میں "منازل السائرہ" لکھی جو ان کی شاہکار تصنیف کہلائی۔ اور اس ناول کی وجہ سے اُنہیں اُردو میں چارلس ڈکنز کے نام سے یاد کیا گیا اور نذیر احمد اور مولانا الطاف حسین حالی نے ہمت اور حوصلہ افزائی کی اور فرمایا:

"مجھے اُمید ہے میرا بھتیجا میرا نام میرے بعد قائم رکھے گا۔"

ان دونوں اصلاحی ناولوں کے بعد ان کی شہرت ایک بلند پایہ مصنف کی حیثیت سے پھیلنی شروع ہوئی۔ ۱۹۰۳ء سے رسالہ "مخزن" میں افسانے اور مضامین شائع ہونے لگے۔

---

[1] "تمدن" اپریل ۱۹۱۱ء بحوالہ "عصمت" جولائی ۱۹۶۴ء ص ۱۰۰

اور ۱۹۰۳ء میں ہی علامہ کا ایک طویل افسانہ "نصیر اور خدیجہ" جسے اُردو کا پہلا افسانہ بھی شمار کیا جاتا ہے، شائع ہوا۔ اور پھر یہ سلسلہ ۱۹۰۸ء تک چلا۔ جس میں ایک درجن سے زیادہ افسانے اور مضامین شائع ہوئے۔ پھر "صبح زندگی" شائع ہوئی تو دلی کے باکمال ادیب کے طرزِ تحریر کی دلآویزی زبان کی شیرینی اور واقعات کے پیرایۂ بیان کی دردانگیزی کی دھوم مچنے لگی۔

۱۹۱۱ء میں حقوقِ نسواں کی حمایت وحفاظت میں رسالہ تمدّن جاری کیا۔ جو پانچ سال تک بڑی خوبی سے چلتا رہا۔ اور جسے مُلک کے مایۂ نازاہلِ قلم کی اعانت حاصل کی تھی۔ جن میں مولوی نذیر احمد، منشی ذکار اللہ، مولانا حالؔی، احمد علی شوق قدوائی، مولانا شادؔ عظیم آبادی، قاری سرفراز حسین، اشرف حسین، حکیم ناصر علی، شرف الحق، مولانا طباطبائی، محمد اشرف گورگانی جیسے باکمال مستقل مضمون لکھتے رہے۔ مگر اس وجہ سے کہ 'تمدّن' نے اپنے سب سے بڑے مقصد حقوق نسواں پر مسلمان مردوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۱۳ء سے اس کی اشاعت میں بے قاعدگی آنے لگی۔ کیوں کہ باوجود اپنے بلند معیار علمی وادبی مضامین کے حقوقِ نسواں کا مطالبہ وہ پھانس تھی۔ جو تمدّن کے قدر دانوں کو کھٹکتی رہی۔ لہٰذا مالی مشکلات اور اشاعت میں بے قاعدگی کی وجہ سے وہ بند ہوگیا۔

۱۹۰۷ء میں جب شیخ عبدالقادر (ممبر انڈین کونسل لندن) رسالہ "مخزن" کو دلی لائے تو اس وقت راشد الخیری سرکاری ملازم تھے۔ مگر ملازمت میں ان کا کبھی جی نہیں لگا۔ وہ رسالہ مخزن کے لئے مضامین لکھتے رہے، لیکن سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے خود پرچے نہیں نکال سکتے تھے۔ ان کے مضامین کو بار بار پڑھنے سے چند مستورات کو یہ خیال پیدا ہوا کہ دفتر مخزن سے اگر علیحدہ ایک رسالہ عورتوں کا جاری کیا جائے تو عورتوں کے جذبات کو زیادہ مؤثر پیرائے میں اور ان کی ضروریات کو بہتر طریقے سے پورا کیا جا سکے گا۔ لہٰذا شیخ محمد اکرام صاحب جو مخزن پریس کا تمام کام دیکھتے تھے، ان کی نگرانی میں ۱۹۰۸ء میں "عصمت" کا پہلا پرچہ شائع ہوا۔ [۱]

"عصمت" کے مقاصد میں ایک بڑا مقصد مستورات میں مضمون نگاری کا شوق پیدا

---

[۱] "عصمت" جولائی ۱۹۶۴ء ص: ۱۰۸

کرنا تھا۔ اس زمانے میں خواتین مضمون نگار گنتی کی تھیں۔ لہٰذا جہاں راشد الخیری نے اپنے مخصوص رنگ میں بڑے بڑے موثر مضامین تحریر فرمائے، وہاں نہایت ہی عام فہم زبان میں خانہ داری، بچوں کی پرورش، حفظانِ صحت وغیرہ چھوٹے چھوٹے مضامین عورتوں کے فرضی ناموں سے بھی لکھے۔ اس طرح کے مضامین نے خواتین نے مضمون نگاری کا شوق پیدا کر دیا اور "عصمت" کو اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔

"عصمت" کو مستورات کے لئے کیا کام کرتے تھے اور شریف ہندوستانی متوسط طبقے کی خواتین کے لیے کس قسم کے مضامین کی ضرورت تھی اس کے متعلق راشد الخیری نے ۱۹۰۹ء کے رسالے میں اشتہار دیا جو اس طرح سے تھا:

> "خواتین کے واسطے "عصمت" میں دینی اور دنیاوی دونوں قسم کی فلاح و بہبودی ملحوظ ہے۔ کنواری لڑکیوں کو عصمت بتائے گا کہ کنوارپتے کی زندگی ان کو کس طرح گزارنی ہے۔ ماں باپ کا ادب، بہن بھائیوں کی خدمت، بڑوں کی تعظیم، چھوٹوں سے محبت ان کا فرض منصبی ہے۔ جس نئی دنیا میں اُنہیں شامل ہونا ہے، اس کے لیے اُنہیں کیا تیاری کرنی ہے.............. عصمت بتائے گا کہ اُنہیں گھر کس طرح رکھنا ہے۔ روپے کا مصرف کیا ہے۔ خاندان کے ساتھ کس طرح بسر کرنی ہے......" [۱]

المختصر "عصمت" نے تعلیم نسواں کی حمایت، معاشرتی خرابیوں کی اصلاح، سلیقہ شعاری، ہنرمندی، انتظام خانہ داری، بچوں کی پرورش، غرض فرائض و حقوق، مذہب اور اخلاق، تاریخ اور معلومات معاشرت اور تمدن پر ایسے موثر اور سبق آموز افسانے اور مضامین لکھے کہ ہندوستانی گھرانوں میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔

"عصمت" کی اشاعت کا دوسرا سال ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ شیخ عبدالقادر نے مخزن لاہور لے جانے کا فیصلہ کیا اور شیخ محمد اکرام جن کی نگرانی میں "عصمت" جاری کیا گیا تھا۔

---

[۱] "عصمت" ۱۹۰۹ء بحوالہ "عصمت" راشد الخیری نمبر ۱۹۳۶ء ص: ۱۲

بیرسٹری کے لیے لندن جانے کی تیاری کرنے لگے تو عصمت جاری رہنے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ راشد الخیری ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کرلیں اور انہوں نے یہی کیا کہ چودہ پندرہ برس کی سرکاری ملازمت عصمت پر قربان کردی۔

۱۹۰۵ء میں ہفتہ وار اخبار "سہیلی" جاری کیا۔ ۱۹۱۶ء میں دفتر "عصمت" میں زبردست آگ لگی تو سہیلی جاری نہ رہ سکا۔ ۱۹۱۶ء کی آتش زدگی سے عصمت کی اشاعت میں بھی بے قاعدگی آگئی اور کاروباری لحاظ سے بہت نقصان ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں شامِ زندگی صرف بیس دن میں لکھی۔ اور اسے وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد آج تک کسی اردو کتاب کو حاصل نہیں ہوئی۔ اس کتاب نے مصنف کو "مصورِ غم" کا خطاب دلوایا۔ اس کے بعد راشد الخیری نے کتاب کا ڈھیر لگا دیا۔ اور دو درجن کے قریب کتابیں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۳ء تک کے زمانے میں لکھ ڈالیں جو مختلف حضرات نے شائع کیں۔ دو درجن کتابیں آٹھ دس سال کے عرصے میں بارہ بارہ بار چھپیں۔ "صبحِ زندگی" اور "شامِ زندگی" کے بیس بیس ایڈیشن شائع ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں عصمت اور راشد الخیری کی تصانیف پر چند اعتراضات پر مضمون نگاروں کے طرف سے زنانہ اخبار نے شائع کیے تھے۔ راشد الخیری نے "میں اور میری تصانیف" کے عنوان سے اسی زمانے میں عصمت میں ایک مضمون لکھا تھا، جس میں تحریر فرمایا تھا:

> "اب میں تمام مراحل طے کرچکا ہوں جب ایک مصنف تعریف سے خوش اور اعتراض سے ناخوش ہوسکتا ہے، میں نے معترضین کی تحریریں پڑھی ہیں اور اسی طرح موافقین کی بھی تصنیف کے بعد ایک کامیاب مصنف کی جو توقعات ہوسکتی ہیں وہ میری اچھی طرح پوری ہوگئی ہیں اور میرا یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ پوری صدی میں بھی مشکل سے کوئی ایسا مصنف سرزمینِ ہند میں پیدا نہیں ہوا۔ جس کی معمولی نہیں ضخیم کتابیں ڈیڑھ دو ہزار سال کے عرصے میں اس کی آنکھوں کے سامنے دس دس بارہ بارہ ہزار کی تعداد میں شائع ہوئی ہوں۔ المختصر قبولیت کی انتہا ہو یا عمر کا تقاضا اب طبیعت تعریف سے اس قدر سیر ہوچکی ہے کہ اعتراض اور تعریف دونوں

برابر لگتے ہیں۔" [۱]

اسی زمانے میں جب راشد الخیری کی تصانیف کے خلاف مضامین شائع ہو رہے تھے۔ اِس کے جواب میں عصمت کی ایک مضمون نگار محترمہ صفیہ حسن کانپور نے لکھا تھا:

"اور حق یہ ہے کہ علامہ راشد الخیری کی تصانیف نے عورتوں کے لیے آبِ حیات کا کام کیا ہے اور اسلام کی لاج رکھی ہے۔ اگر یہ کتابیں نہ ہوتیں تو نہ معلوم یہ بدنصیب لڑکیاں اسلام کے ساتھ کیا کچھ کر بیٹھتیں۔ میرا چونکہ یہ ایمان ہے کہ میں نمازِ فجر سے پہلے کلام اللہ اور پھر مولانا محترم کی تصانیف کا مطالعہ کرتی ہوں۔"

۱۹۲۱ء میں راشد الخیری نے گیارہ سال کی یتیم بچیوں کے لیے تربیت گاہِ بنات قائم کیا۔ جہاں برِ صغیر کی مختلف حصّوں کی سیکڑوں یتیم و نادار بچیوں نے بحیثیت بورڈ تعلیم و تربیت حاصل کی اور ہفتہ وار پرچہ "سہیلی" دوبارہ ۱۹۲۲ء میں شائع کیا۔ مگر سال بھر بعد وہ بند ہو گیا۔ ۱۹۲۷ء میں مسلمان بچیوں کے لیے ماہ نامہ "بنات" جاری کیا۔ جس کا خاص مقصد مسلمان بچیوں میں مذہبیت پیدا کرنا تھا۔ جس کی ادارت بعد میں اپنے چھوٹے صاحبزادے صادق الخیری کو سونپ دی۔ اس کے علاوہ ۱۹۱۸ء میں پنجاب یونیورسٹی نے اردو کورس علامہ سے صحیح کروائے۔ ۱۹۳۱ء میں نیشنل یونیورسٹی نے سب سے پہلا اردو ممتحن مقرر کیا۔ ۱۹۲۷ء میں حکومتِ بہار و اڑیسہ نے شمالی ہند سے بحیثیت ماہرِ اُردو ہندی اردو کی ترقی کے سلسلے میں مشورے حاصل کیے۔ اسی بیچ ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۱ء تک چار پانچ سال کے عرصے میں راشد الخیری نے تصانیف کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ جس میں "شبِ زندگی" "شامِ زندگی" "طوفانِ حیات" "بزمِ آخر، جوہرِ قدامت، آفتابِ دمشق" "ماہِ عجم" "عروسِ کربلا" "یاسمینِ شام" "محبوبۂ خداوند" طویل و مختصر افسانے اور مضامین شامل ہیں جو بہت مقبول ہوئے اور تابڑ توڑ نئے نئے ایڈیشن چھپے۔

غرضیکہ راشد الخیری مشرق کے جامع حیثیات مصنّف تھے۔ وہ اُردو کے بہت

---

[۱] "عصمت" کراچی ۱۹۵۸ء ص ۴۸

بڑے ادیب اور صاحبِ طرز مصنّف تھے۔ وہ اُردو میں مختصر افسانہ نویسی کے ایک طرح کے بانی اور چوٹی کے ناول نگار تھے۔ سیرت نویسی میں ان کا پایہ ہمیشہ بلند ہے اور واقعات نگاری میں بھی۔ وہ مورّخ بھی تھے اور مترجم بھی۔ سیاح بھی اور مبلّغِ اسلام بھی۔ تبصرہ نگار بھی تھے اور جرنلسٹ بھی۔ جن عورتوں کو قلم پکڑنا بھی نہیں آتا تھا مصوّرِ غم کی تحریروں نے انھیں اہلِ قلم بنا دیا۔

بہ ظاہر وہ عملی سیاست سے ہمیشہ الگ تھلگ رہے، لیکن جہاں اور جب مسلمانوں پر زیادتی کی گئی وہ تڑپ اُٹھے۔ طرابلس، مراکش اور ہندوستان کے مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے گئے، ان سے متاثر ہوکر اُنہوں نے ایسے درد بھرے مضامین اور افسانے لکھے کہ آج بھی مطالعہ کیا جائے تو آنسو نکل پڑتے ہیں۔ غم نگاری میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ راشد الخیری نے ایک دو نہیں متعدد تصانیف میں روتوں کو ہنسا کر لطیف طنز و مزاح اور سنجیدہ ظرافت نگاری کے نمونے بھی پیش کیے۔ ان کی شاعری میں درد و غم سے بھرپور وہ نظمیں ہیں جن کے اشعار دل کو چھوتے ہیں۔ ان کا اسلوبِ بیان ان کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ دلّی کی ٹکسالی ٹھیٹ عورتوں کی زبان لکھنے میں راشد الخیری کا کوئی ثانی نہیں۔ بقول حضرت جوش ملیح آبادی:

شمع راتوں کو بہاتی تھی جو آنسو اُٹھ گئی
دہر سے وہ کیا گیا دلّی سے اُردو اُٹھ گئی

حقوقِ نسواں کی حمایت:

ناول نگاری کے پہلے دَور کے ناول نویسوں میں نذیر احمد نے ہندوستانی معاشرت کا نقشہ سب سے کامیابی کے ساتھ کھینچا تھا۔ خصوصاً مسلمان عورتوں کی جیتی جاگتی تصویریں دکھانا اُنھیں کا حصّہ تھا۔ راشد الخیری نے بھی اپنے لیے یہی موضوع منتخب کیا۔ تاریخی ناول بھی اُنہوں نے لکھے، لیکن ان کا خاص میدان مسلمان عورت کی معاشرت ہے۔ نذیر احمد اور ان کے ہم عصروں کے زمانے میں مشرقی تمدّن میں تھوڑی بہت جان باقی تھی۔ چنانچہ عورتیں اپنی تہذیب کے بچے کھچے سرمائے کو لیے اپنے گھروں میں بیٹھی تھیں اور مردوں کے مقابلے میں کسی قدر سکون سے اپنی زندگی بسر کر رہی تھیں، لیکن اُنیسویں صدی کے آخر میں

گردشِ روزگار نے اس نظم کو درہم برہم کر دیا۔ ایک طرف تو اقتصادی مشکلات یعنی ذرائع آمدنی کے گھٹنے اور ضروریاتِ زندگی کے بڑھنے سے گھر کی پُر سکون زندگی میں خلل پڑ گیا۔ اور دوسری طرف انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب کے اثر سے مردوں اور عورتوں کی زندگی کی راہیں الگ ہو گئیں۔ عام مدرسوں کے کھل جانے کے بعد گھر کے مکتب بند ہو گئے۔ لڑکے تو اسکولوں میں پڑھنے لگے، مگر لڑکیاں پردے کی وجہ سے وہاں نہیں جا سکیں۔ اس لیے ان کی تعلیم ہی موقوف ہو گئی۔ پرانے طرز کی تربیت نئی روشنی کے مردوں کے نزدیک اتنی گھٹ گئی کہ عورتیں اس کی طرف سے بھی بے پرواہ ہو گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مطلق جہالت نے عورتوں کی حالت کو اور بدتر کر دیا۔ اور مرد جو بڑی حد تک اس پستی کے ذمہ دار تھے انہیں اور بھی ذلیل سمجھنے لگے۔ بعض آزاد خیال لوگوں نے اپنی لڑکیوں کو اسکول میں تعلیم دلائی لیکن یہ تعلیم اس قدر ناقص تھی کہ اس نے انہیں گھر کی زندگی اور معاشرت سے بالکل بیگانہ کر دیا۔

مختصر یہ کہ اس دَور کے تمدّن میں حالانکہ مذہبیت کا دَور دَورہ تھا، مگر عورت ناقص العقل سمجھی جاتی تھی اور اس کی وہ عزّت و حرمت و وقعت اور حیثیت نہ رہی جو اسلام نے اس کو دی تھی۔

مسلمان عورتوں کی یہ افسوسناک صورتِ حال راشد الخیری کے پیشِ نظر تھی انہوں نے دیکھا کہ عورتیں اپنی جہالت، تعصّب، تنگ نظری اور مردوں کی خود غرضی اور غفلت کی وجہ سے جانوروں کی سی زندگی گزار رہی ہیں۔ غیرت اور حمیّت نے انہیں ان کی حمایت میں قلمی جہاد کرنے پر مجبور کر دیا اور ان کا احساس تھا کہ اللہ کے احکام کے سراسر خلاف اور رسولِ اکرمؐ کے ارشادات کے قطعی برعکس عورتوں کی حالتِ زار دیکھ کر اتنا متاثر ہوا کہ ان کی تحریر درد و غم کے رنگ میں ڈوب گئی۔ مگر الم نگاری کے لوٹتے دل کی فریاد اصلاح کے جوش میں بھرے ہوئے ارادے کی للکار بنی۔ انہوں نے حقوقِ نسواں کی حمایت میں قلم سے جہاد شروع کر دیا۔ ان پر فقرے بھی کسے گئے۔ پھبتیاں بھی اڑائی گئیں۔ مار ڈالنے تک کی دھمکی دی گئی۔ مگر ان کے ارادوں میں لغزش نہیں آئی۔ وہ پہاڑ کی طرح اٹل اپنی جگہ کھڑے رہے۔ خلوص سے بھری آواز میں مسلمانوں کو اس راستے پر بلاتے رہے جو پیغمبرِ اسلام کا بتایا ہوا ہے۔ انہوں نے فرمایا:

"مجھے معلوم ہے ہر تعلیم یافتہ نوجوان ہر مذہبی حکم کو عقل کے ترازو میں اور فلسفے کی کسوٹی پر تولتے اور پرکھتے ہیں۔ اس لیے مجھے یہ کہنے میں تامّل نہ ہوگا کہ حقوقِ نسواں کے سلسلے میں میری زبان سے جو کچھ نکل رہا ہے مذہب سے علیحدہ ہوکر بھی ایک لفظ ایسا نہیں جس سے عقلِ سلیم متفق نہ ہو۔" [۱]

ان پر یہ الزام بھی لگایا گیا کہ انہوں نے عورت کو آزادی کا سبق پڑھا کر مسلمانوں کے گھروں کی خوشی و امن کو غارت کر دیا ہے۔ ہندوستانیوں کے گھر اجاڑ دیے ہیں، مگر علّامہ عورت کے حقیقی غم خوار تھے۔ انہوں نے حقوقِ نسواں کے لیے نہ صرف قلمی جہاد کیا بلکہ عملی طور پر اپنی تمام عمر طبقۂ نسواں کی حمایت میں صرف کر دی۔ انہوں نے اصلاحِ نسواں اور فرائضِ نسواں کے متعلق "عصمت" "سہیلی" اور "بنات" پرچے جاری ہی اسی لیے کیے تھے کہ عورتوں کو ان کے فرائض سے آگاہ کیا جائے۔ مردوں کو حقوقِ نسواں کی طرف متوجہ کرنے کے لیے انہوں نے ۱۹۱۱ء میں تمدّن ایک ماہنامہ الگ سے جاری کیا۔ حالانکہ اس کا ادبی معیار بلند تھا۔ مگر حقوقِ نسواں کا مطالبہ وہ پھانس تھی جو مردوں کے دلوں میں کھٹکتی رہی۔ صرف اسی وجہ سے کثیر مالی نقصانات اٹھا کر رسالہ "تمدّن" بند کرنا پڑا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جتنا مردوں کو حقوقِ نسواں کی طرف انہوں نے متوجّہ کیا، اس سے بہت زیادہ انہوں نے عورتوں کو اپنے فرائض کی طرف متوجّہ کیا۔ ان کے مشہور و معروف ضخیم معاشرتی و اصلاحی ناولوں کا، طویل افسانوں اور ناولٹ کا متعدّد مختلف افسانوں کے مجموعوں اور ان گنت مضامین کے متعدّد مجموعوں کا لبِّ لباب ہی اصلاحِ معاشرت و اصلاحِ نسواں ہے۔

ان کے متعلق بمبئی کرانیکل میں چھپا تھا:

"مولانا کی کثیر التعداد تصانیف سے ظاہر ہے کہ ان کی تمام زندگی صنفِ کمزور کی حمایت و وکالت میں بسر ہوئی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آنے والی نسلیں انہیں ہمیشہ ممنونیت اور افتخار کے ساتھ یاد کریں گی کہ

---

[۱] انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے اجلاس میں تقریر جنوری ۱۹۲۵ء
بحوالہ "عصمت" اگست ۱۹۶۴ء ص: ۶۶

اُنہوں نے عورت کو وہی درجہ دلانے کی لگاتار کوشش کی جو اُسے اسلام نے عطا کیا ہے۔ وہ تقریباً ۵۰ سال تک مسلمان عورت کے حقوق کے لیے لڑتے رہے۔ ان کی تمام کتابیں صرف ایک مقصد کی حامل ہیں۔ یعنی صنفِ نازک کو ذلّت سے نکال کر ترقی پر لے جانا" ؎[1]

وہ چاہتے تھے کہ عورتوں کو ان کی ضرورت کی مناسبت سے تعلیم و آزادی حاصل ہو اور وہ تمام حقوق مل جائیں جو شرع اسلام نے دیے ہیں، مگر وہ اپنی معاشرت میں جو ہر قدامت کو نہ ہاتھ سے جانے دیں اور مغرب کی تقلید ہرگز نہ کریں۔ جہاں اُنہوں نے بہت سی پرانی رسموں کو لغو قرار دیا ہے وہاں بعض رسموں کو مصلحت اور ضرورت پر مبنی قرار دیا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان عورت کے مستقبل کی تعمیر ماضی کی بنیاد پر ہو۔

اور ان کی اصلاح و ترقی کی کوششوں میں انہیں جو کامیابی حاصل ہوئی کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ مصوّرِ غم کی اِن دردانگیز تقریروں کے علاوہ جو اُنہوں نے حقوقِ نسواں، تعلیمِ نسواں اور فرائضِ نسواں کے موضوع برِصغیر کے مختلف مقامات پر کیں۔ اس کی بنیاد ان کی وہ تصانیف و رسالے ہیں جو بے حد مقبول و معروف ہیں۔ وہ برِصغیر کی خواتین کے محسنِ اعظم اور عورتوں کی مظلومیت کے ترجمان تھے۔ اردو ادب اور اس ادب سے متاثر ہونے والی سوسائٹی پر راشد الخیری کا یہ احسان ہمیشہ رہے گا۔

سیرت و شخصیت:

راشد الخیری کی ملکی و قومی، ادبی و علمی کارناموں کے ساتھ ان کی ذاتی زندگی بھی انتہائی کامیاب تھی اور دیکھنے والوں کے لیے ہر حیثیت سے قابلِ رشک۔ رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے:

"تم میں سب سے اچھا ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہے۔"

راشد الخیری کی تصانیف اس حدیث کی تفسیر ہیں اور خود ان کی زندگی اس ارشاد کا نمونہ

؎[1] ضیاء الدین برنی بمبئی کرانیکل ۱۹۶۴ء
بحوالہ "عصمت" راشد الخیری سوانح عمری ص ۴۹،

تھی۔ وہ ایک بہترین بیٹے، بہترین باپ، بہترین شوہر ہر لحاظ سے کُنبے والوں کے لیے بہترین تھے۔ ان کا حافظہ حیرت انگیز تھا۔ موسیقی سے بہت دل چسپی تھی۔ ہندوستانی اور انگریزی بہت سے کھیل جانتے تھے۔ بدن کسرتی، جسم دوہرا، قد لمبا اور سفید بگلا داڑھی، ذلالت اور نور چہرے سے برستا تھا۔ اپنی رفیقۂ حیات سے معصوم غم کو اس قدر محبت تھی کہ کُنبے بھر میں ان کی مثال میاں بیوی کی دی جاتی تھی۔ اُنہوں نے دنیا کو دکھا دیا کہ میاں بیوی کا رشتہ کیا ہوتا ہے۔ اُنہوں نے اپنی رفیقۂ حیات کو کبھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ ان کے تعلقات بے مثل تھے۔ ان کی بہن ان کی شفقت پر اور ان کی ساس ان کی سعادتمندی پر فخر کرتی تھیں۔ ناسمجھ اکلوتے بچوں کی طرح وہ اپنی اولاد والے بچوں کا خیال رکھتے تھے اور ان پر جان چھڑکتے تھے۔ وہ اپنے بہن بھائیوں کے دُکھ درد میں برابر کے شریک رہتے تھے اور اپنی طرف سے کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتے تھے۔ اگر اتفاق سے کسی کے یہاں عذر و علالت کی نوبت ہوتی تو بے قرار ہو کر دلی ہمدردی سے رات دن میں کئی بار تکلیف اُٹھا کر مخلصانہ محبت و مہربانی کے ساتھ عیادت کو جاتے اور مریض کے پاس بیٹھ کر اس کی تیمارداری میں بھی اپنی خوش تدبیری سے مدد دے کر خود مریض اور اس کے متعلقین کو مسرور و مشکور کر جاتے۔

علامہ کا یہ شریفانہ اور مخلصانہ سلوک صرف بھائیوں کے ساتھ ہی نہیں تھا بلکہ وہ اپنی بھاوجوں کو بھی حقیقی بہنیں تصور کرتے تھے اور ان کا بھی ہر طرح سے پاس و لحاظ رکھتے تھے۔ بھتیجیوں اور بھتیجوں اور ان کے شوہروں کو بھی اپنے ہی بچوں کی طرح سمجھ کر بزرگانہ شفقت سے ان کے مزاج و مذاق اور طبیعت کے موافق اپنے لطائف و ظرائف سے خوش کرتے رہتے اور اس حُسنِ عمل کا صرف زبانی ہی جمع خرچ نہیں تھا بلکہ وہ بڑی فیاضی سے اپنا روپیہ اور بیش قیمت وقت بھی صرف کرتے تھے۔ کہیں بھی سیر و تفریح کو جاتے تو اپنے عزیزوں کو بھی شرکت کی دعوت دیتے اور اپنی خوش طبعی سے سب کو ہنسا کھلا کر خود بھی لُطف اندوز ہوتے۔

راشد الخیری دوستوں میں مجسمۂ اخلاق تھے، مگر دوستی کی وجہ سے اپنے کسی اصول کو نہیں چھوڑتے تھے۔ لیکن دوستوں کی تکلیف اور آرام کا ان کو پورا احساس تھا اور جب ان میں سے کوئی کسی ناگوار حادثے کی وجہ سے رنجیدہ نظر آتا تھا تو علامہ اپنے وقت اور

توجہ کو اس کی تسکینِ قلب کے لیے بے دریغ صرف کرتے تھے۔

قاری سرفراز حسین لکھتے ہیں:

"میں ان کے بچپن کا بہت اچھا دوست تھا۔ ہم آپس میں ایک دوسرے سے رُوٹھ جاتے تھے مگر مولانا روٹھنا جانتے ہی نہ تھے۔ ایک دفعہ میں مولانا سے کسی بات پر بگڑ گیا اور شاید مہینہ ڈیڑھ مہینہ میری اور مولانا کی بات چیت بند رہی۔ اس دَوران میرے چھوٹے بھائی کی شادی ٹھہری۔ مولانا سے میں خفا تھا، اس لیے بُلاوا کیوں دیتا۔ لیکن ٹھیک بارات کی روانگی کے وقت مولانا خود آ گئے اور مجھ سے اس سادگی اور یگانگت سے ملے کہ میری آنکھیں بھر آئیں اور بے اختیار میں ان کے گلے لگ گیا۔" [1]

صداقت اور جرأت، استقامت و استقلال، صبر و ضبط، قناعت و توکّل، وضع داری اور شریف النفسی یہ انسانی خوبیاں ان میں انتہا درجے کی تھیں۔ چھچھورا پن، غیبت، خود ستائی، تکلّف، تصنّع ان چیزوں سے وہ کوسوں دُور رہتے تھے۔ کبھی اپنی دھونس جماتے نہ رعب بٹھاتے تھے اور نہ احسان جتاتے تھے۔ متعدد تصانیف ان کی زندگی میں شائع ہوئیں اور مقبولیت کی انتہا کو پہنچیں۔ مگر کسی کتاب میں اپنی تصویر تک شائع ہونے نہیں دی۔ شہرت و نام و نمود سے اُنھیں سخت نفرت تھی۔ محض مدرسے کی مجبوریوں کی وجہ سے دُور دراز مقامات کے دَورے کیے اور مدرسے کے مفادات اور قومی درد رکھنے والی خواتین کی حوصلہ افزائی کے لیے دورے کے حالات لکھے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اپنی ذاتی بڑی سے بڑی ضرورت کے لیے بھی کسی بڑے سے ملنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ ایک دفعہ ایک بزرگ نے جن کی شان دار خدمات کے صلے میں حکومت نے بڑے بڑے خطابات اور اعزازات سے اُنھیں سرفراز فرمایا۔ دلّی کے صاحب چیف کمشنر سر جان طامسن نے حضرت علامہ کے لٹریچر کے متعلق نہایت شان دار الفاظ فرمائے۔ ان حضرت بزرگ نے علامہ

---

[1] "عصمت" راشد الخیری نمبر ص: ۳۸۰

تک یہ الفاظ پہنچا کر فرمایا کہ آپ ایک دفعہ صاحب سے لے جا کر مل لیجیے۔ شمس العلماء کا خطاب اس سال آپ کو مل جائے گا۔ اس کا جواب راشد الخیری نے ان الفاظ میں دیا:

"آپ کی محبت کا شکریہ۔ اب آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے"[۱]

اُنہوں نے اپنی کتاب میں اپنی تصویر کی اشاعت پسند نہیں فرمائی اور نہ ہی اپنی کوئی کتاب کسی کے نام ڈیڈیکیٹ کی۔ سوائے چار تصانیف کے۔ جن کے دیباچوں کی اشد ضرورت تھی۔ کسی کتاب کا دیباچہ نہیں لکھا۔ کسی کتاب میں تعارف یا تقریظ کسی شخص سے نہیں لکھوائی۔ سوائے ٹائٹل پر نام آنے کے اپنا نام کسی کتاب میں دوبارہ آنا پسند نہیں فرمایا۔ وہ اپنی تصانیف اور اپنے رسالوں کے متعلق تعریفی خطوط تک کی اشاعت پسند نہیں کرتے تھے۔ نام و نمود، شہرت و خود نمائی جلسوں اور بے نتیجہ تقریروں سے اُنہیں سخت نفرت تھی۔ کسی جلسے کسی تحریک میں حصہ نہیں لیتے تھے۔

ان کی عاجزی، انکساری، سادگی، وضع داری، مہماں نوازی عملی انسانی ہمدردی دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتی تھی۔ اپنے سے کم درجے کے لوگوں سے وہ انکساری سے ملتے تھے۔ جو لوگ دنیاوی اعتبار سے اونچے سمجھے جا سکتے تھے، اُن سے ملنے سے وہ ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ اور بڑی سے بڑی شخصیت سے بھی وہ مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ طبیعت بے حد غیور تھی یعنی وہ اپنی خودداری کسی قیمت پر مجروح نہیں کر سکتے تھے۔ راشد الخیری مصورِ غم کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی تصانیف پڑھنے کے بعد غالباً اس کا یقین مشکل ہے کہ وہ خوش طبع بھی ہوں گے، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان سے زیادہ زندہ دل ان کا زیادہ شگفتہ مزاج اور خوش طبع انسان مشکل سے ہوتا ہے۔ جناب مُلّا واحدی ایڈیٹر نظام المشائخ راشد الخیری کی خوش طبعی کے متعلق لکھتے ہیں:

"میں ایسے تین شخصوں کو جانتا ہوں جو مولانا کے لڑکپن سے بڑھاپے تک دوست رہے۔ ایک مرزا محمد اشرف گورگانی، دوسرے مولوی اشرف حسین، تیسرے قاری سرفراز حسین۔ ان دوستوں میں کس حد

---

[۱] "عصمت" راشد الخیری نمبر ۱۹۶۴ء ص ۶

تک مذاق ہوتا تھا۔ اس کی معتدل مثالیں سُناتا ہوں“ [1]

مولانا طرزِ تحریر میں شمس العلماء نذیر احمد کے پیرو تھے۔ میں نے ایک دفعہ راشد الخیری کو جانشینِ مولوی نذیر احمد لکھ دیا۔ مولوی نذیر احمد کے فرزند بشیر الدین بھی بیسیوں کتابوں کے مصنف تھے۔ انہیں کسی نے جا لگایا کہ بیٹے کے ہوتے ہوئے بھتیجے کو جانشین بنایا جارہا ہے۔ بشیر الدین نے اس کی پرواہ نہیں کی۔ مگر قاری سرفراز حسین نے اس کا لطیفہ بنا دیا کہ ایک شادی میں علامہ کو ایک ڈھیلی ڈھالی ٹخنوں سے ذرا اونچی شیروانی پہنے دیکھ کر مولوی بشیر الدین سے مخاطب ہوکر کہا واحدی نے راشد کو جانشینِ مولوی نذیر احمد غلط نہیں لکھا۔ قسم ہے پیدا کرنے والے کی میں نے اپنی دونوں آنکھوں سے نذیر احمد کے پاس یہ شیروانی دیکھی ہے جو آج راشد کے جسم پر ہے۔

مولانا کو یہ مذاق یاد تھا۔ کئی سال بعد ایڈورڈ پارک میں یہی مجمع تھا۔ کوئی بڈھا سفید داڑھی، خمیدہ کمر، بھیک مانگتا اس مجمع کے پاس آکھڑا ہوا۔ علامہ نے بے ساختہ اس سے کہا:

”آؤ میاں قاری برکت اللہ بڑی مدت میں دکھائی دیے۔ تمہارے دیدار کو تو آنکھیں ترس گئیں“

قاری برکت اللہ قاری سرفراز کے والد کا نام تھا۔

علامہ نے کئی کتابیں لکھ ڈالیں، مگر مجبور ہوئے بغیر قلم ہاتھ میں نہیں پکڑا کرتے تھے۔ اپنی طبیعت سے مجبور ہو جائیں یا بچوں اور دوستوں کی خواہش سے دب جائیں۔ بہر کیف لکھتے تھے زبردستی ہونے سے اور لکھتے تھے صرف دس منٹ سے گیارہواں منٹ لکھنے میں صرف نہیں کرتے تھے۔ دس منٹ لکھا اور باہر آگئے۔

”شامِ زندگی لکھنے کا جب فیصلہ ہوا تو مہینوں ٹال مٹول کرتے رہے اور جب میں نے مہینوں رخنہ پڑتے دیکھا تو ایک چھوٹی سی کوٹھری میں میز کرسی بچھوا دی جس میں لیٹنے کی گنجائش نہیں تھی اور ان کی آمد کا انتظار

---

[1] ”نقوش“ لاہور شخصیات نمبر ۱۹۵۵ء ص ۱۰۵

کرنے لگا اور علامہ جب آئے تو کہا چلو۔ اس کوٹھری میں وہ جیسے ہی اندر گھسے میں نے باہر سے کُنڈی لگا دی اور سُنا دیا چاہے لکھو چاہے نہ لکھو۔ دو گھنٹے سے پہلے نہیں کُھلے گی۔ جب دو گھنٹے لکھ کر علامہ پسینوں میں ڈوبے ہوئے مسکراتے ہوئے کوٹھری سے نکلے اور شام زندگی کے ابتدائی صفحات پڑھ کر سُنائے تو ایک صفِ ماتم بچھ گئی اور ہم سب دوست اپنی لیڈری بھول کر ان کے پاؤں میں لوٹنے لگے"۔ [1]

علامہ کی آواز میں آخری عمر تک رعب تھا۔ مثنوی میر حسن کے بڑے مدّاح تھے۔ ان کے بیسیوں شعر ان کی خوبیاں اور باریکیاں ان کو یاد تھیں۔ ایک دفعہ مولانا نیاز فتحپوری "نگار" لکھنؤ کے مالک تھے ان کے دوست عارف صاحب علامہ سے ملنے آئے۔ عارف صاحب پر لکھنؤ کا اثر تھا وہ بھی مثنوی گلزارِ نسیم کا ذکر کرتے کہ

سنبل مرا تازیانہ لانا
شمشاد اسے سُولی پہ چڑھانا

تو علامہ بڑی سنجیدگی سے کہتے واہ پھول پنکھڑیوں سے کیا لاٹھی پونگے کی خدمت لی ہے۔ جو طبعِ سلیم کے لیے بارِ گراں ہے۔ یہ سُن کر عارف صاحب دم بخود ہو جاتے۔

خواجہ فضل احمد نے ایک بار داغ کا یہ شعر پڑھا:

خدا کی قسم اس نے کھائی ہے آج
خدا کی قسم ہے مزہ آ گیا

علامہ کو زبان کا بہت باریک فرق محسوس ہوا اور "قسم ہے خدا کی" جگہ "خدا کی قسم" ان سے سننا برداشت نہ ہو سکا۔ فرمایا:

"ارے کمبخت قسم ہے خدا کی کہہ۔ داغ کی روح کو کیوں تڑپا رہا ہے"۔ [2]

وہ بالکل غلط اور بے جوڑ مصرعوں کو سُن کر بہت لُطف اُٹھاتے تھے۔ بڑے مزے لے کر

---

[1] "نقوش" لاہور۔ شخصیات نمبر ۵، ۱۹۵۵ء ص ۱۰۳ [2] "نقوش" لاہور۔ شخصیات نمبر ۵، ۱۹۷۵ء ص ۱۰۶

یہ شعر دُہراتے رہے۔

خدا کی قسم اُس نے کھائی ہے آج
قسم ہے خدا کی مزہ آگیا

مزا آگیا مزا آگیا

سمجھتا ہوں سب کچھ مگر دوستو
یہ دل ہے جدھر آگیا، آگیا

سچ تو یہ ہے کہ وہ یاروں کے یار اور دوستوں کے غم خوار تھے۔ ان کی غم خواری صرف لفظی نہیں تھی بلکہ وہ عملی ہمدردی کے ثبوت کے لیے بھی حاضر تھے۔ رمضان بھر ان کا دسترخوان کُشادہ رہتا تھا۔ یتیم اور بیوائیں روزانہ ان کے دسترخوان سے سیر ہوا کرتی تھیں۔ وہ بوڑھوں میں بوڑھے، جوانوں میں جوان اور بچّوں میں بچّے تھے۔ جس صحبت میں بیٹھ جاتے اُنہیں کے مطابق ڈھل جاتے۔ اُنہوں نے زندگی کا مفہوم اچھی طرح سمجھا تھا۔ اور حق یہ ہے کہ جب تک وہ زندہ رہے حق ادا کرتے رہے۔ دنیائے ادب اور دنیائے علم نے اُنہیں مصوّرِ غم کا خطاب دیا تھا۔ اور جن کی تحریروں نے لاکھوں لوگوں کے دلوں کو گداز کر کے آنکھوں سے آنسو جاری کر دیے، مگر بذاتِ خود وہ بہت زندہ دل، خندہ رُو اور خوش مزاج شخصیت تھے۔

علامہ راشد الخیری کے چار بچّے تھے۔ راشدہ بیگم، واجدہ بیگم، رازق الخیری، صادق الخیری۔ سب ذہین، ملنسار، مہمان نواز اور اپنے والد ماجد کی طرح غریبوں کے دُکھ درد میں شریک ہونے والے۔ راشدہ بیگم سب سے بڑی تھیں اور غیر معمولی خوبیوں کی مالک تھیں۔ ان کے بعد رازق الخیری جنہوں نے اردو کی تاریخِ صحافت میں کسی ایک رسالے میں طویل مدّت تک ایڈیٹنگ کا کام انجام دینے کا ریکارڈ قائم کیا۔ ان کی پہلی شادی ۱۹۲۲ء میں محترمہ خاتون اکرم سے ہوئی۔ لیکن دو سال کے بعد ۱۹۲۴ء میں ان کا عین جوانی میں ۲۴ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ پہلی بیوی کے انتقال پر علامہ کو کتنا صدمہ ہوا تھا، اس کا اندازہ ان مضامین سے کیا جا سکتا ہے جو اُنہوں نے چند روزہ مہمان بیوی کی یاد میں لکھے اور جن میں خون کے آنسو بہائے۔ یہ مضامین کتابی صورت میں "وداعِ خاتون" کے نام سے شائع ہوئے۔ اس کتاب کے پہلے مضمون "مہمان دُلہن" کا ابتدائی صفحہ اس طرح ہے:

"باغباں کی ہزار ہا توقعات کے سائے میں یہ ننھا سا پودا لہلہا لہلہا کر پروان چڑھ رہا تھا۔ سبز پتیاں دن بھر تمازتِ آفتاب کی آغوش میں پھولتیں اور رات کو جب متحرک ذرات خاموش ہو جاتے تو پودا سرسرا کر ہوا سے اٹھکھیلیاں کرتا۔ شبنم کے آب دار موتی اس کا منہ چوم چوم کر محبت کے ہاتھ گلے میں ڈالتے اور خاتمۂ شب پر صبا ٹھنڈے جھونکوں کا غسل دیتی۔ پودا بڑھ رہا تھا سرسرا کر لہلہا کر۔ کس کو خبر تھی یہ پودا کیسے کیسے گل کھلائے گا۔ اس کا پہلا پھول بہارِ حسن کو معطر کر دے گا اور شرمگیں نگہ عروس اس کی خوشبو سے ہمکنار ہوتی ہوئی بلند ہوگی اور جب بہار خزاں میں بدلے گی اور لو کے تند گرم جھونکے شاداب و سبز پتوں کو جھلسا دیں گے۔ ہری ہری کونپلیں ٹوٹ کر زمین کا دم بھریں گی تو اس وقت یہ نازک پودا اپنی پوری طاقت سے خزاں کے مقابلے کو آگے بڑھے گا۔ ایک دردانگیز کشمکش اور نظامِ عالم کا ایک پُر لطف قہقہہ بجلی بن کر گرے گا۔ فتح کا سہرا خزاں کے سر باندھتے ہوئے اس ہونہار پودے کو تاراج و برباد کر دے گا۔ لیکن اس سے کچھ پہلے جب بلبل آخری مرتبہ شاخِ گل پر جھولے گی۔ یہ آخری پھول مرجھانے سے پہلے ہوا کو بدستور معطر کرے گا۔

کون جانتا تھا کہ جس کا پہلا پھول زینتِ عروس تھا اس کا آخری پھول آرائشِ قبر ہوگا۔ جس کے پہلے پھول نے دلہن بنایا اس کا آخری پھول قبر میں دیکھے گا۔ انسانی پودا بھی قبر بسانے کو دلہن بن رہا ہے جس کے ساتھ ارمانوں کا ڈھیر ہوگا۔ یہ سب کچھ ہونے والا ہے اس لیے پودا چاروں طرف چھا رہا ہے۔ ہنس ہنس کر کھل کھل کر ......[1]

اس کے بعد ان کی علالت کے حالات اس قدر دردانگیز ہیں کہ پڑھ کر ہچکی بندھ جاتی تھی۔ خاتونِ اکرم تہذیب کی ممتاز اور کامیاب نامہ نگاروں میں سے تھیں۔ وہ

---

[1] "عصمت" جولائی ۱۹۶۴ء ص ۱۹۵

بہت لائق اور صاحبِ قلم تھیں اور ملک کی ان چند خواتین میں سے تھیں جن پر طبقۂ نسواں فخر کرسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ راشد الخیری جتنے اچھے لکھنے والے تھے اتنے ہی اچھے انسان بھی۔ ان کی بے شمار تصانیف کی طرح ان کی خانگی زندگی کے تمام پہلو سبق آموز ہیں۔

رحلت:

علاّمہ راشد الخیری کی بظاہر صحت اچھی تھی کہ دو ماہ بیمار رہ کر ۳ فروری ۱۹۳۶ء کی صبح ۷ بج کر ۵۵ منٹ پر دہلی میں وفات پائی اور برِ صغیر کے ہر پڑھے لکھے گھرانے میں کہرام مچ گیا۔ رنج میں ڈوبے ہوئے اتنے مضامین، مرثیے، نوحے المختصر اتنا ماتمی لٹریچر مصورِ غم کے انتقال پر شائع ہوا کہ بقول ایڈیٹر روزنامہ "ملت" دہلی کے کسی ادیب یا رہنما کی وفات پر شائع نہیں ہوا تھا[1] علامہ نے زندگی میں کبھی پسند نہیں کیا تھا کہ ان کی تعریف میں کچھ لکھا جائے، مگر ان کے بعد ان کے مصلحانہ کارناموں اور مختلف ادبی حیثیتوں پر نظم و نثر میں ہزاروں صفحے لکھے گئے۔ اور لکھنے والوں نے رو رو کر لکھے۔

"حیاتِ راشد کا آخری باب" اس عنوان سے مولانا رازق الخیری نے علامہ کی علالت اور وفات کے حالات قلمبند کیے ہیں جو بعد میں "وداعِ راشد" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔

خراجِ عقیدت:

> گزشتہ ہفتہ کا اہم ترین واقعہ نادر اور جادو نگار ادیب مولانا راشد الخیری کا انتقال ہے۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال ساقی دہلی ۱۹۳۶ء
>
> "مرحوم راشد الخیری کا انتقال ایک ناقابلِ تلافی سانحہ ہے۔ مرحوم ہندوستان کی ادبی محفل کے صدر نشینوں میں تھے۔ ان کی وفات سے جو جگہ خالی ہوگئی

---

[1] بحوالہ "عصمت" ۱۹۳۶ء

ہے وہ پُر ہونا محال ہے۔!

مولانا ظفر علی خاں روزنامہ "زمیندار" لاہور ۱۹۳۶ء

"صبحِ زندگی" "شامِ زندگی" کا وجود جب تک اُردو میں ہے، کوئی ان کے مصنف کے نام کو کیسے بھول سکتا ہے۔ ان سطور کے راقم نے اپنے ابتدائی دَور میں جن چند اہلِ قلم کے مضامین و تصانیف سے اُردو سیکھی، ان میں ایک مرحوم بھی تھے۔"

عبدالماجد دریا آبادی "صدقِ جدید لکھنؤ ۱۹۳۶ء

مسلمان عورتوں کے آنسوؤں کی جھڑی بندھی ہوئی تھی کہ ان کا وہ ہمدرد و غم گسار بزرگ جس کو موت نے چھین لیا جس کے دل کی درد مندیاں اُنوکھی صورت میں تیر و نشتر بن کر بے حس دلوں کو زندہ کر گئیں۔

بسترِ مرگ پر بھی اُنہیں اُردو کا خیال تھا جس چمنستان کو نصف صدی اُنہوں نے اپنے خون سے سینچا تھا اور اُس کی خزاں کو بہار سے بدل دیا تھا، ان کے دم کے ساتھ وہ بھی دم توڑ رہی تھی۔ اس لیے مرتے وقت اُنہیں اپنی زبان کا خیال ستا رہا تھا۔ شاہد احمد دہلوی جو "ساقی" کے ایڈیٹر تھے، اپنے پاس بلایا اور نہایت نحیف آواز میں آہستہ سے بولے:

"میاں شاہد سر جوڑ کر کام کرو۔ اُردو کو اگر زندہ رکھنا چاہتے ہو تو مل کر کام کرو۔ اُردو کو زندہ رہنا چاہیے۔ ہندوؤں کو ملاؤ۔ اُنہیں تم الگ نہیں کر سکتے۔ ہندوؤں نے بھی اُردو کو ترقی دی۔ کوئی انجمن بناؤ اُنہیں برابر کا شریک رکھو۔ ان سے مل کر کام کرو۔ یہ کام اب تمہارے کرنے کے ہیں۔ میں تو مر چکا۔" ۵

---

۵ شاہد احمد دہلوی "ساقی" راشد الخیری نمبر بحوالہ عصمت ۱۹۳۶ء ص ۲۳

اس میں کوئی شک نہیں کہ راشد الخیری نے اپنی پہلی ہی تصنیف "حیاتِ صالحہ" میں یہ تحریر فرما دیا تھا کہ گو یہ قصہ مسلمان خاندان کا ہے، مگر ہر قوم اور ہر فرقے کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے اور حقیقتاً اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ علامہ کی تصانیف سے جس قدر فائدہ مسلم خواتین کو پہنچا ہے اُتنی ہی ان کی تصانیف غیر مسلم خواتین کے لیے بھی مفید ثابت ہوئیں۔ اور ان کی وفات پر غیر مسلم ادیبوں کے مضامین بھی شائع ہوئے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تصانیف اور رسالے غیر مسلموں میں بھی بہت مقبول ہیں۔ بسترِ مرگ پر راشد الخیری نے یہ آخری شعر پڑھا: ~

ہے یہ بہارِ آخری اس کو غنیمت جانیے
یہ صحبتِ شب پھر کہاں راشد کے اٹھ جانے کے بعد[1]

فیروز شاہ کوٹلہ دہلی کے قبرستان میں ان کی قبر ہے۔

---

[1] "اُردو کا پہلا افسانہ نگار راشد الخیری" ۱۹۹۲ء ص ۳۴

باب دوم

سماجی اور تہذیبی بُرائیوں کے خلاف
اِصلاحی تحریکیں

ہندوستانی تہذیبی زندگی میں مذہب کے دُور رس اثرات اور اس کی گہری جڑوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ قدیم ہندوستان کی سماجی اور تہذیبی زندگی آرٹ، فنونِ لطیفہ اور سماجی اداروں کی مختلف سرگرمیوں میں مذہب ہی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ قدیم ہندوستان کی یہ روایات اپنی تمام خرابیوں اور خوبیوں سمیت اُنیسویں صدی میں موجود تھیں۔ برطانوی اقتدار کی ابتدا میں جب یہاں مغربی تعلیم، تہذیب اور تصوّرات کی اشاعت ہوئی تو سارے مُلک میں ایک نئی لہر نے جنم لیا۔ ہندوستان کا باشعور طبقہ خصوصاً اس سے بہت متاثر ہوا اور انہیں احساس ہوا کہ جب تک معاشرے کی مذہبی برائیوں کو دُور کر کے مذہب کی اصل سادگی اور سچّائی کا چہرہ سامنے نہیں لایا جاتا، اُس وقت تک ہندوستانی عوام کو اوپر اُٹھانے اور اُنہیں ترقی کی راہ پر آگے بڑھانے کا کام سخت مشکل ہوگا۔ اس طرح کی تحریکیں ہندو اور مسلم دونوں فرقوں میں شروع ہوئیں اور اُنہوں نے جو کام کیے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اس طرح کی تحریکوں کی نشوونما بنگال میں پہلے ہوئی۔ راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۳۳ء - ۱۹۴۷ء کے بنگال برہمو سماج کی بنیاد ڈالی۔ یہ تحریک اتنی سرگرم تھی کہ اُنیسویں صدی کے آخر تک اس کا اثر سارے ہندوستان پر پڑنے لگا۔ اس نے مذہبی قدامت پسندی اور تنگ نظری کے خلاف سخت جدّوجہد کی۔ اُس نے بُت پرستی اور ستی جیسی فرسودہ رسموں کے خلاف آواز بلند کی اور ثابت کیا کہ ہندو مذہب خدائے بزرگ و برتر کا سیدھا سادہ مذہب ہے جو کسی طرح بھی اِن رسموں کو گوارہ نہیں کرتا۔ بنگال میں اس تحریک کا خاصا زور رہا۔ ستی کی رسم کے خاتمے کی کوششوں نے ہندو سماج میں عورت کی زبوں حالی کا مکمل نقشہ سامنے کر دیا۔ کلکتہ

میں ہندو کالج قائم کیا گیا، جو ہندوستان میں انگریزی تعلیم کو عام کرنے کا پہلا ادارہ ہے۔ ان سرگرمیوں نے تعلیم یافتہ طبقے میں بیداری کا احساس پیدا کیا۔

راجہ رام موہن رائے کے بعد رابندر ناتھ ٹیگور اور کیشپ چندر سین جیسے روشن خیال جیسے رہنماؤں نے اس تنظیم میں اور سرگرمی اور روشنی پیدا کی۔ کیشیپ چندر سین نے تمام مُلک کا دَورہ کرکے اپنی زوردار تقریروں کے ذریعے مذہبی اصلاح کا ایسا صُور پھُونکا کہ نوجوان اور باشعور طبقہ ان کے گرد اکٹھا ہوتا گیا۔ اُنہوں نے ذات پات کی فرسودہ رسموں اور تصوّر کے خلاف آواز اُٹھائی اور مختلف ذاتوں کے درمیان شادی بیاہ کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دیا۔ اس کے علاوہ اُنہوں نے ۱۸۶۶ء میں ایک الگ برہمو سماج کی بنیاد ڈالی۔ اُنہوں نے ہندوؤں کی پرانی کتابوں کی نئی تفسیر و تعبیر کی۔ وحدانیت، عقلیت اور ترقی پسندی پر زور دیا۔ ان کی نئی انجمن کے پانچ حصے تھے۔ پہلا فلاح و بہبود اور تعلیم سے متعلق تھا۔ دوسرا علمی کتابوں کی تفسیر و ترجمہ اور اشاعت سے متعلق تھا۔ تیسرے کا تعلق خیرات اور چیریٹی فنڈس کی تنظیم سے تھا۔ چوتھے حصہ کا تعلق نشہ بندی سے تھا اور پانچویں کے ذریعے شادی بیاہ میں آسانی اور سہولت پیدا کرنے اور مختلف ذاتوں ہی نہیں بلکہ مختلف مذاہب کے درمیان شادی بیاہ کرانا مقصود تھا۔

اِن اصلاحی سرگرمیوں سے سارا مُلک متاثر ہوا۔ عورتوں اور لڑکیوں کی تعلیم کا چرچا عام ہوا۔ عورتوں کی فلاح و بہبود کا ذکر عام ہوا۔ مدرسے کھولے جانے لگے۔ بیوہ عورتوں کی دوسری شادی کا اہتمام ضروری سمجھا جانے لگا۔ نتیجتہً سماجی بیداری عام ہونے لگی۔

اسی کے ساتھ سوامی دیانند سرسوتی کی آریہ سماج کی بھی تحریک شروع ہوئی۔ وہ سنسکرت کے بڑے عالم تھے۔ اُنہوں نے تمام قدیمی کتابوں کا مطالعہ کرکے پُرانوں اور دوسری مقدّس کتابوں کے ایک بڑے حصّے کو ہندو مذہب کا جزو ماننے سے انکار کیا اور قدیم ویدوں کو ہندو مذہب کی اصل قرار دیا۔ نئے ڈھنگ سے ان کی تفسیر کی۔ وحدانیت کی تبلیغ اور بُت پرستی کی مخالفت ان کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ اُنہوں نے ذات پات کے سسٹم کو ہندو مذہب کے مخالف بتایا اور یہ کہا کہ پہلے ان کا کوئی وجود نہیں تھا۔

لالہ لاجپت رائے آریہ سماج کے چار بنیادی اصول بتاتے ہیں:

۱۔ خدائے برتر کو اپنا خالق اور سارے انسانوں کو بھائی سمجھنا۔
۲۔ مرد عورت کو برابر سمجھنا۔
۳۔ ہر قوم اور ہر انسان کے ساتھ سچائی، دیانت اور اچھے طریقے سے پیش آنا۔
۴۔ تمام انسانوں سے محبت کرنا[1]

یہ بڑی اہم اور دُور رس اثرات کی حامل تحریک تھی اور ایک طرح سے عوامی تحریک تھی۔ بنگال کے سوامی رام کرشن کی تعلیمات کو سوامی وویکانند نے پھیلایا جس میں عقلیت پر زور دیا گیا تھا۔ ان تحریکوں اور مغربی تعلیم کے اثر و نفوذ سے ایک عام بیداری کی لہر ہندوستانی معاشرے میں دوڑ رہی تھی۔ ہندوستان میں جدید تعلیم کی ابتدا انگریزوں کی آمد سے ہوتی ہے۔ انگریزوں کی آمد سے ہندوستان میں سب سے بڑی تبدیلی یہ آئی کہ تعلیم کا دروازہ جو اب تک محدود لوگوں کے لیے تھا، اس کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ مشنریوں نے مغربی تعلیم کی تبلیغ اور انگریزی زبان و ادب کے مطالعے کی ہمت افزائی کی۔ اس کے علاوہ کچھ حکام سرکاری اور روشن خیال ہندوستانیوں نے مغربی افکار کی نشر و اشاعت میں حصہ لینا شروع کیا۔ اس کے علاوہ انگریزی نظامِ تعلیم کے ارتقا میں ہندوستان کی سماجی اور سیاسی تبدیلیاں بھی اثر انداز ہوئیں۔ کیونکہ ہندوستان میں بہت سے تعلیمی تنازعات برطانیہ کی تعلیمی کوششوں سے پیدا ہوئے۔ نیز بہت سے اداروں کی داغ بیل انگلستان کے اداروں کو سامنے رکھ کر ڈالی گئی۔

چنانچہ رفتہ رفتہ رائے عامہ انگریزی تعلیم کے حق میں ہموار ہونے لگی۔ اس کے پیچھے کئی عوامل کار فرما تھے۔ مثلاً مشنری سرگرمیاں انگریزی کو زیادہ مقبول بنانے کے حق میں تھیں۔ دوسرے راجہ رام موہن رائے جیسے ہندوستانی نے انگریزی زبان و ادب اور اس کے ذریعے مغربی سائنس کا علم حاصل کرنے پر زور دے رہے تھے۔ بڑی بات یہ کہ انگریزی حاکموں کی زبان تھی۔ جس کی وجہ سے اس کی سیاسی اہمیت بڑھتی جا رہی تھی۔ لوگوں کو ملازمتیں حاصل کرنے میں انگریزی زبان ایک اہم ذریعہ بن چکی تھی۔ انگریزی زبان کی بڑھتی ہوئی مانگ کی وجہ سے جنرل کمیٹی آف پبلک انسٹرکشن بھی اُسے بہت دنوں تک نظر انداز نہیں کر سکی اور ۱۸۲۳ء میں اُسے آگرہ اور کلکتہ کے کالج میں انگریزی کی کلاسیں کھولنی پڑیں۔

---

[1] آریہ سماج بحوالہ پریم چند کا تنقیدی مطالعہ: قمر رئیس ص: ۱۰۶

میکالے نے ۱۸۳۵ء میں انگریزی کی ضرورت اور افادیت پر زور دیا۔ جس کے زیرِ اثر لارڈ ولیم بینٹنک نے ۱۸۳۵ء میں ایک ریزولیشن پاس کیا اور یہ حکم صادر کیا۔

"ہز لارڈ شپ کی رائے ہے کہ برطانوی حکومت کا عظیم مقصد ہندوستان کے باشندوں میں یورپی ادب اور سائنس کی ترقی ہونا چاہیے اور یہ تمام امدادی رقمیں جو تعلیم کے لیے تھیں، اُن کا بہترین مصرف یہ ہے کہ انہیں انگریزی علم پر لگا دیا جائے۔" [1]

الغرض برطانوی دورِ حکومت میں خصوصاً بیسویں صدی کے آغاز تک پرائمری تعلیم کے فروغ کے لیے ہندوستانی رائے عامہ تیار ہو چکی تھی۔ اسکولوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ مغربی علوم و فنون سے ہندوستانیوں کی دلچسپی بڑھ رہی تھی۔ جس نے ہندوستانیوں کو نئے نئے خیالات سے روشناس کیا۔ نئے تعلیمی مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے اچھی اچھی کتابوں کا ترجمہ مقامی زبانوں میں ہونے لگا۔ تاریخ، الجبرا، جیومیٹری اور سائنس کے متعلق کتابیں تصنیف ہوئیں اور انہیں اسکولوں اور کالجوں میں پڑھایا جانے لگا اور جدید تعلیم نے ایک ایسی تاریخ کی داغ بیل ڈالی جس کا مقصد ہندوستانی سماج میں اصلاحات کرنا تھا۔ اس عہد میں ہندوستانی زندگی میں نئی قیادت پیدا ہوئی جس میں پنڈت ایشور چند ودیا ساگر، کیشپ چندر سین، سوامی وویکانند، جسٹس ایم جی رانا ڈے، پنڈت مدن موہن مالویہ، دادا بھائی نوروجی، سرسید احمد خاں اور دوسرے بہت سے رہنما سامنے آئے۔ جنہوں نے ہندوستانی زندگی میں نشاۃ الثانیہ کی ابتدا کی۔

اصلاح و تربیت کا عہد:

اس میں شک نہیں کہ برطانوی سامراج کے لوگوں نے خصوصاً سول سروس اور محکمۂ تعلیم کے افسران نے ملک کو مغربی تمدن کے فوائد کے ساتھ تعلیمی اور تہذیبی برکات سے

---

[1] نورالله اور ناٹک ص ۱۰۳
بحوالہ ہندوستانی تعلیمی ترقی میں اردو ناولوں کا حصہ ص: ۱۸

مالامال کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ جدید تہذیب جو ہندوستان میں انگریزوں اور اینگلو انڈین سوسائٹی کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔ وہ ایک مخصوص طبقے کی تہذیب تھی، قومی تہذیب نہیں تھی جس نے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں ایک حد تک ہم رنگی پیدا کر دی، مگر ہم آہنگی پیدا نہ کر سکی۔ ابتدا میں ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں نے برطانوی نظام تعلیم کو نہایت ہی شک کی نظر سے دیکھا۔ اس کے کئی وجوہ تھے۔ اوّل تو یہ کہ مسلمان اپنی پرانی تہذیب سے مطمئن تھے تو وہ قدیم نظام تعلیم جو نسل در نسل چلا آرہا تھا، اس میں تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ ان کو یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ:

> "ان کا سیاسی انحطاط دراصل ذہنی اور اخلاقی انحطاط کا نتیجہ ہے۔ ان کی مذہبی اور معاشرتی زندگی میں، ان کے ادب اور فنونِ لطیفہ میں حقیقت کی رُوح کم اور تصنع کا رنگ زیادہ ہو گیا ہے اور مجموعی طور پر ان کی تہذیب اس قدر جامد ہو گئی ہے کہ اس میں نشو و نُما پانے کی اور اپنے آپ کو نئے خیالات کے مطابق کرنے کی طاقت نہیں رہی۔"[۱]

دوسرے یہ کہ مغربی تہذیب کے ساتھ نئے زمانے اور نئی زندگی کے جو فرحت بخش جھونکے آئے۔ ان میں انہیں سیاسی و معاشی غلامی کی زہریلی گیس کی بو آتی تھی، اس لیے وہ اس سے دُور بھاگتے تھے۔

لیکن اس کے ٹھیک برعکس ہندوؤں نے جو زمانے کے ساتھ بدلنے کی صلاحیت رکھتے تھے، انگریزی مدارس کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ انگریزی تعلیم سے مستفید ہو کر ایک طرف تو اپنی روزی کا ٹھکانہ کر لیا اور دوسری طرف حاکم قوم کی نظروں میں عزت پائی لیکن مسلمان بحیثیت ایک جماعت ایک مدت تک مغربی تعلیم کے اثر سے کافی دُور رہے۔ کیوں کہ انہیں اس بات کا خدشہ تھا کہ اگر انہوں نے اپنے بچّوں کو سرکاری اسکول اور

---

[۱] ڈاکٹر عابد حسین: "ہندوستان میں انگریزی تہذیب اور تعلیم کا تسلط" ۱۹۶۴ء ص ۱۱۹ بشمول ہندوستانی تعلیم اور اس کے مسائل

کالجوں میں بھیجا تو یقیناً وہ اپنا مذہب تبدیل کر دیں گے یا اُن پر عیسائیت کا غلبہ ہو جائے گا۔ چنانچہ گورنمنٹ اسکول اور کالجوں میں ہندو طلبار کی تعداد زیادہ تھی۔

بنگال میں صورتحال اور بھی خراب تھی کیونکہ یہاں مسلمان تعلیمی اعتبار سے کافی پسماندہ تھے۔ یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے ایک مدت تک اپنے آپ کو نئے نظامِ تعلیم سے بالکل الگ رکھا کیونکہ انہوں نے انگریزی تعلیم کو مذہب اور روایات کے منافی سمجھا۔ جدید نظامِ تعلیم میں پرانی تہذیبی قدروں اور روایتی مذہبی احساسات کو فروغ پانے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اسکولوں میں مسلمان اساتذہ کی غیر موجودگی اور ان اسکولوں میں مادری یا عربی زبان میں مذہبی تعلیم دینے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ چنانچہ ان عوامل کے پیشِ نظر مسلمانوں نے جدید تعلیم سے اپنے آپ کو بالکل الگ رکھا، لیکن اس کے ٹھیک برعکس بمبئی، مدراس اور اودھ کے مسلمانوں نے اس کو نظر انداز نہیں کیا۔ جس کا اثر رفتہ رفتہ بنگال کے مسلمانوں پر بھی پڑا اور وہ بھی خصوصاً اعلیٰ طبقے کے مسلمان انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہونا شروع ہوئے، لیکن ۸۵ فی صد جو زراعت میں لگے ہوئے تھے اور جو گاؤں میں رہتے تھے انگریزی تعلیم سے بالکل بے بہرہ رہے، لیکن ۲۶-۱۸۲۴ء کے درمیان بنگال کے مفصل علاقے میں انگریزی تعلیم کی لہر شروع ہوئی۔ ۱۹۲۶ء میں مرشد آباد کے بچوں کے لیے ایک اسکول قائم کیا گیا۔ اس سے قبل ۱۸۲۴ء میں ڈھاکہ کے لوگوں نے بھی انگریزی تعلیم کی طرف اپنی توجہ کا اظہار کیا۔ ایک نئے کھونچال سے ۱۸۵۷ء کی شورش کے نتیجے میں مسلمانوں کا معاشرہ دوچار ہو رہا تھا۔ چونکہ مسلمان ایک فاتح قوم کی حیثیت سے آئے تھے لہٰذا اپنے علوم و فنون اور زبان و ادب کو چھوڑ کر عیسائیوں کی زبان و علم کو سیکھنا اپنی تہذیب و شرافت کے خلاف سمجھتے تھے۔ جب کہ انگریزی تعلیم کی ابتدا میں سب سے پہلے بنگال اور کلکتہ میں اسکول اور کالج قائم کیے گئے۔ لیکن ان اداروں میں زیادہ تر طلبا ہندو تھے، جنہوں نے انگریزی زبان اور جدید علوم و فنون سے مسلمانوں کے مقابلے میں پہلے رابطہ پیدا کیا، جس کے نتیجے میں ہندوؤں کے متوسط طبقے کو ابھرنے کا موقع ملا۔ یہی متوسط طبقہ ہندوؤں کی معاشرتی، ثقافتی، سیاسی اور تعلیمی اصلاح کی تحریک کو آگے بڑھانے میں نہایت کارگر ثابت ہوا۔ اس کے علاوہ برطانوی نظامِ حکومت نے جتنی بھی سہولتیں فراہم کیں، ان سے ہندوؤں نے پورا فائدہ حاصل کیا۔ انگریزی تعلیم

کی وجہ سے انہیں ملازمت میں داخل ہونے کا موقع پہلے ملا۔ ہندوستانیوں میں سب سے پہلے چیف جسٹس کے عہدے پر ہندو کو ہی مامور کیا گیا۔ اسی طرح پہلا ہندوستانی ضلع انچارج ہندو تھا۔ ڈویژنل کمشنر کے دو عہدوں پر ہندو ہی مامور کیے گئے۔ ۱۹۰۹ء تک کوئی بھی مسلمان اس عہدے کے لیے منتخب نہیں کیا گیا۔ سول سروس میں بھی پہلے داخل ہونے والا ہندوستانی ہندو تھا۔ لیکن اس کے برعکس مسلمانوں نے مغربی علوم سے دیر میں رابطہ پیدا کیا۔ چونکہ اس وقت مسلمان جدید تعلیم سے بالکل بے بہرہ تھے۔ تعلیم کے نام پر صرف مدرسے یا دوسرے مقامی اسکول تھے، جہاں پر فضا پر صرف مذہبیت طاری تھی۔ بچوں کو مذہب، اخلاقیات اور شریعت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی اکثریت غربت کا شکار تھی۔ معاشی کمزوری کی وجہ سے مسلمان اس وقت زیادہ تر فوج اور پولیس میں ملازمت اختیار کرتے تھے۔ ان میں جو پڑھے لکھے تھے وہ منشی یا کلرک کا پیشہ اختیار کرتے تھے، لیکن جب انگریزوں نے فارسی کو ہٹا کر انگریزی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا تو سیکڑوں ہزاروں مسلمانوں کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد تو مسلمانوں کے لیے فوج اور پولیس کی ملازمت کے دروازے بھی بند ہو گئے۔ سیاسی طاقت چھن جانے سے ان کے حوصلے پست ہو گئے۔ پرانی درس گاہیں ویران ہوتی جا رہی تھیں۔ مذہبی خیالات پر جمود طاری ہونے لگا تھا۔ ان حالات میں مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے اور انہیں از سر نو منظم کرنے کے لیے کئی تحریکیں وجود میں آئیں۔ جن میں کچھ تحریکیں مسلمانوں کے اسلامی عقائد کی تشریح کرنے کے لیے چلائی گئیں اور کچھ تحریکیں ایسی تھیں جن کے ذریعے مسلمانوں کی سیاسی، سماجی، تعلیمی، ثقافتی زندگی میں اصلاحات لانے کی کوشش کی گئی۔ مثلاً وہابی تحریک، احمدیہ تحریک اور تبلیغی جماعت کی تحریک کی نوعیت بالکل مذہبی تھی، لیکن اس کے برعکس مسلمانوں کی تعلیمی، اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی حالت کو بہتر بنانے کے لیے ملک کے کئی حصوں میں کئی تحریکیں چلائی گئیں، جن میں سرسید کی علی گڑھ تحریک، کلکتہ کے نواب عبداللطیف کی محمڈن لٹریری اینڈ سائنٹیفک سوسائٹی، شیخ عبداللہ کی انجمن خواتین اسلام، سید امیر علی کی سینٹرل نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن، بدرالدین طیب جی کی انجمن اسلام وغیرہ نے مسلمانوں کی تعلیمی اور سماجی اصلاح کے لیے نمایاں کام کیے۔ یہ تحریکیں پورے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے نشاۃ ثانیہ کا باعث ہوئیں۔

غرض ۱۸۵۷ء کی شورش کے نتیجے میں مسلمانوں کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ گرچہ ہندو مسلمان دونوں شانہ بشانہ انگریزوں سے برسرِ پیکار ہوئے تھے، لیکن اس جنگ میں مسلمان اُجڑ گئے تھے۔ انگریز افسران مسلمانوں سے پوری طرح انتقام لینے کے درپے تھے۔ مسلمان صنعت و تجارت سے ناآشنا تو تھے ہی، بغاوت کے الزام میں اُنہیں سرکاری ملازمتوں سے بھی محروم کر دیا گیا۔ ان کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔ انگریز افسر پہلے ہی مسلمانوں سے بدظن تھے، اُنہیں اپنا حریف اور مدِمقابل خیال کرتے تھے۔ دوسری طرف مسلمان اپنے آپ کو حکمراں طبقہ خیال کرتے تھے۔ خصوصاً مسلمان علماء انگریزوں کی مخالفت میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ بعض علماء تو ایسے تھے کہ انگریز کو کہیں راستے میں دیکھ لیتے تو آنکھیں بند کر لیتے اور مجبوراً کسی انگریز سے ہاتھ ملانا پڑ جاتا تو اُس وقت تک ناپاک خیال کرتے تھے جب تک اُسے رگڑ کر نہ دھو لیتے تھے۔ سرسید کو مسلمانوں کی حالت کا بھرپور احساس تھا۔ سرسید مسلمانوں کی تباہی کا تذکرہ "لائل محمڈنز آف انڈیا" میں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"یہ بدبختی کا وہ زمانہ ہے جو ۱۸۵۷-۵۸ء میں ہندوستانی مسلمانوں پر گزرا۔ کوئی آفت ایسی نہیں جو اس زمانے میں نہ ہوئی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی گو وہ رام دین ماتادین نے ہی کی ہو۔ کوئی بلا آسمان سے ایسی نہیں چلی جس نے زمین پر پہنچنے سے پہلے مسلمان کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔ جو کتابیں اس ہنگامے کی بابت تصنیف ہوئیں وہ بھی میں نے دیکھی ہیں تو ہر ایک میں یہی دیکھتا ہوں کہ ہندوستان میں مفسد بدذات کوئی ہو مگر مسلمان مسلمان مسلمان ہے۔ مگر میں اس کے برخلاف سمجھتا ہوں۔ میں نہیں دیکھتا کہ مسلمانوں کے سوا کوئی ایسا ہے جس نے خالص سرکار کی خیرخواہی میں اپنی جان مال عزت و آبرو کھوئی ہو۔" [۱]

---

[۱] سرسید اور ہندوستانی مسلمان علی گڑھ ۱۹۷۹ء ص: ۵۳ بحوالہ

چنانچہ اس صورتِ حال نے سرسید کو اتنا متاثر کیا کہ وہ مسلمانوں کے حالات بدلنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جو حال اس وقت قوم کا تھا وہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ چند روز اسی خیال اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے۔" [۱]

آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کے تمام مسائل کا حل اور تمام مصائب کا علاج یہ ہے کہ اُنہیں جدید تعلیم سے روشناس کرایا جائے۔ چنانچہ اُنہوں نے جدید تعلیم کے منصوبے تیار کرنے کا کام شروع کر دیا اور اسی مقصد سے ولایت کا سفر بھی کیا اور حقیقت یہ ہے کہ اگر سرسید نے جدید تعلیم کو مسلمانوں میں عام کرنے کی مہم نہ شروع کی ہوتی تو اس قوم کو جہالت اور افلاس سے کبھی نجات نہ ملتی۔ چنانچہ مسلمانوں نے تعلیم عام کرنے کے لیے سرسید نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ تحریک شروع کی اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا۔ اُنہوں نے ۱۸۸۶ء محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی۔ کیوں کہ ان کی خواہش تھی کہ ملک کے گوشے گوشے میں ابتدائی تعلیم کے ادارے قائم ہوں تاکہ جہاں جہاں مسلمانوں کی آبادی ہو وہاں کانفرنس کے اجلاس منعقد ہوں۔ اُنہوں نے راجہ رام موہن رائے کی طرح جدید تعلیم کی اہمیت پر زور دیا۔ لیکن اُنہوں نے انگریزی تعلیم کے ساتھ مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کو بھی نصاب میں شامل کیا۔ اس کے علاوہ انگریزی کھیلوں کا بھی انتظام کیا گیا۔ جو اس وقت ہندوستانی اسکولوں اور کالجوں میں ہر دلعزیزی کے درجے تک پہنچے ہوئے تھے۔ غرض علی گڑھ تحریک کا خاطر خواہ اثر یہ ہوا کہ انگریزی تعلیم کی طرف مسلمانوں کا رُجحان بڑھنے لگا۔ سائنٹیفک اور جدید علوم کی طرف مسلمان دلچسپی کی نظر سے دیکھنے لگے۔ سر سید کی تعلیمی تحریک کے متعلق جواہر لال نہرو لکھتے ہیں:

"سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ

---

[۱] سرسید احمد خاں: "لائل محمڈنز آف انڈیا ۸۶ ۶ ص: ۱۲-۱۳
بحوالہ ہندوستانی تعلیمی ترقی

کرنے پر صرف کر دینی چاہیے۔ یقیناً صحیح اور درست تھا۔ میرا خیال ہے کہ بغیر
اس تعلیم کے مسلمان طرزِ جدید کی قومیت کی تعمیر میں کوئی قابلِ قدر حصہ نہ
لے سکتے تھے بلکہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے غلام بن
جاتے جو تعلیم میں ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط[1]

غرض سرسید ہندوستانی مسلمانوں کو جہالت کے غار سے نکال کر جدید علوم و فنون
کی روشنی سے منور کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ یہ سمجھتے تھے کہ مسلمان انگریزی زبان سیکھنے پر راضی
نہیں ہوں گے۔ اس لیے انھوں نے منتخب کتابوں کا ترجمہ اُردو میں کرانے کے لیے سائنٹیفک
سوسائٹی قائم کی۔ ورنکولر یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کی۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں
قدیم علوم اور جدید علوم کے الگ الگ شعبے قائم کیے۔ ان کی اس تعلیمی اور اخلاقی تحریک میں
جن حضرات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان میں مولوی چراغ علی، نواب عماد الملک، سید مہدی علی،
محسن الملک، مولوی مشتاق حسین، وقار الملک، مولوی ذکاء اللہ، الطاف حسین حالی، شبلی
نعمانی، نذیر احمد اور زین العابدین کے نام سرفہرست آتے ہیں۔ جنھوں نے مسلمانوں کی سماجی
اور معاشرتی اصلاح کے سلسلے میں بھرپور کوششیں کیں۔ حالی نے اپنی نظموں کے ذریعے عورتوں
کی تعلیم کی اہمیت اور بیوہ کی دوسری شادی کی ضرورت پر زور دیا۔ شبلی نے دینی تعلیم کے ساتھ
ساتھ دنیاوی علوم کے مختلف پیشوں کو سیکھنے پر اصرار کیا۔ شبلی کا ندوۃ العلماء لکھنؤ اور
دارالمصنفین اعظم گڑھ دراصل اسی تحریک کی اہم کڑی ہیں۔ انھیں کے زیر اثر مولانا ابوالکلام
آزاد اور دوسرے علماء نے بھی مسلمانوں کی سماجی اصلاح پر زور دیا۔ اور ان تحریکوں نے ہندوستان
کے تمام مسلمانوں کے اندر ایک قومی ملی اور تعلیمی احساس کو بیدار کرنے میں ایک قابلِ قدر کارنامہ
انجام دیا۔ اور ان اصلاحی تحریکوں کے اثرات اُس وقت کے اُردو ادب خصوصاً ناولوں میں بخوبی
دیکھے جا سکتے ہیں۔

---

[1] بحوالہ ڈاکٹر نورالحسن نقوی سرسید اور ہندوستانی مسلمان ۱۹۷۹ء ص: ۶۳

ہندوستانی معاشرے میں تعلیمِ نسواں کا آغاز و ارتقاء :

اُنیسویں صدی کے اوائل تک ہندوستانی خواتین میں تعلیم کی رفتار بہت سُست تھی۔ خاص طور سے بنگال کی حالت بہت خراب تھی۔ بمبئی کی حالت بھی کچھ اسی نوعیت کی تھی۔ مدراس کی حالت بھی بہت بہتر نہیں تھی۔ مقابلتاً مسلمانوں میں خواتین کی نجی تعلیم کا ذکر ملتا ہے۔ اونچی ذات کے ہندو خاندانوں میں بھی اس قسم کی تعلیمی ترقی کی شہادتیں ملتی ہیں۔ لیکن پنجاب کی حالت ان تمام صوبوں کے مقابلے میں بہتر تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے پہلی بار ۱۸۱۳ء کے چارٹر ایکٹ کے مطابق ہندوستانیوں کو تعلیم دینے کی ذمہ داری قبول کی۔ لیکن کمپنی کے افسران نے تعلیم کو مردوں تک ہی محدود رکھا۔ اور عورتوں کی تعلیم کی طرف بالکل توجہ نہیں دی۔ کیوں کہ ان لوگوں کا خیال تھا کہ ہندوستانی سماج عورتوں کی تعلیم کے بالکل خلاف ہے۔ لہٰذا اس خطرناک میدان میں قدم رکھنا پریشانیوں کو دعوت دینا ہے۔ کمپنی نے ان دیسی اسکولوں کو بھی مالی امداد سے الگ رکھا۔ جو لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کھولے گئے تھے۔

تعلیمِ نسواں کی تحریک میں عیسائی مشنریوں کا بہت بڑا ہاتھ رہا۔ اُنہوں نے ۱۸۱۹ء میں لڑکیوں کی الگ تعلیم کا رجحان پیدا کیا، لیکن مشنریوں کی کوششوں کے باوجود تعلیمِ نسواں کی رفتار تیز نہیں ہو سکی۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ مثلاً دیہی اسکولوں کی سخت کمی تھی۔ مشنریوں کے ذریعے چلائے گئے اسکولوں میں اونچی ذات کے ہندو اور مسلمان اپنی لڑکیوں کو بھیجنا پسند نہیں کرتے تھے۔ کیوں کہ تبدیلیٔ مذہب کا خطرہ تھا۔ خود برطانوی حکومت نے لڑکیوں کے اسکولوں کی سرپرستی قبول نہیں کی تھی۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں تعلیمِ نسواں کے خلاف تعصب کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم کی کوشش شدید رجحان پیدا کر دے گی۔ لیکن برطانوی حکومت کے اس قدامت پسندانہ نقطۂ نظر میں تبدیلی لانے کا سہرا لارڈ بنٹینک اور لارڈ ڈلہوزی کے سر ہے۔ بنٹینک نے نہایت ہی جرأت مندانہ قدم اُٹھا کر ستی کی وحشیانہ رسم کو ختم کیا تو ڈلہوزی نے عورتوں کی تعلیم کے پیشِ نظر حکومت کے مکمل تعاون اور امداد کا ۱۸۵۰ء میں تاریخ ساز فیصلہ کیا۔

تعلیمِ نسواں کی اشاعت اور اس کے فروغ میں ان روشن خیال انگریزوں کا بھی

بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ جو سیکولر نظام تعلیم پر عقیدہ رکھتے تھے اور ہندوستانیوں کی نجی کوششوں کی ہمت افزائی کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ جدید تعلیم کے میدان میں کام کرنے والے یورپینوں میں صرف مشنری ہی نہیں بلکہ ان میں برطانوی افسروں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ جنہوں نے انفرادی حیثیت سے اس میدان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس قسم کے عمدہ کام کی مثالیں F.D. BETHUNE کی زندگی میں ملتی ہیں۔ جس نے اپنی انفرادی حیثیت سے خود اپنے خرچے سے ہندوستانی لڑکیوں کے لیے ایک سیکولر اسکول ۱۸۴۹ء میں قائم کیا۔ بعد میں یہی اسکول ترقی کر کے بیتھیون کالج کے نام سے ہندوستانی خواتین کا پہلا اور اہم ادارہ بن گیا۔ لبرل اسکولوں میں ڈیوڈ ہیر کا نام ہندوستانی تعلیمی تاریخ میں جلی حروف میں لکھا جاتا رہے گا۔ اُنہوں نے ساری عمر ہندوستانیوں کی تعلیمی ترقی میں صرف کردی۔ خصوصاً تعلیم نسواں کے میدان میں اُنہوں نے ناقابلِ فراموش خدمات انجام دیں۔ بنگالی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے انجمنِ اطفال جو کلکتہ میں ۱۸۲۰ء میں قائم ہوئی اسے ڈیوڈ ہیر DAVID HARE نے بھرپور مالی امداد دی۔ اسی طرح بمبئی کے انفسٹن کالج کے پروفیسر PATLON نے اسٹوڈنٹس لٹریری اینڈ سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی۔ جس کے زیرِ اہتمام لڑکیوں کے کئی اسکول قائم کیے گئے۔

انگریزی نظامِ حکومت مسلط ہو جانے کے بعد ہندوستان کی تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور تعلیمی زندگی میں کئی تبدیلیاں آئیں۔ مغربی افکار اور مغربی تعلیم کی وجہ سے ہندوستانی عوام میں بھی سیاسی شعور بیدار ہوا۔ مغربی فکر کے بعض تصورات مثلاً جمہوریت، آزادی، مساوات، انسان دوستی، اقتدارِ اعلیٰ اور قومیت کے تصورات نے ہندوستانیوں کے ذہن کو متاثر کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریزی نظامِ تعلیم نے ہندوستانیوں کے لیے ایک نشاۃِ ثانیہ کا کام کیا۔ لوگوں کے ذہن میں ایک انقلاب برپا ہوا۔ سوچنے اور سمجھنے کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا۔ ہندوستانی سماج پر ایک مدت سے جو جمود طاری تھا وہ رفتہ رفتہ ایک نئی تبدیلی سے دوچار ہونے لگا۔ مغربی علوم کے مطالعے نے ہندوستانیوں کو دنیا کی مختلف تحریکوں، انقلابوں اور اس کے اثرات کو سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔ ایم پینکر نے انگریزی تعلیم کے اثرات کے متعلق اس بات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جہاں برٹش ایڈمنسٹریشن نے ہندوستانیوں کے لیے بہت کم کیا ہے، وہاں صرف انگریزی تعلیم کے

نفاذ سے ہندوستانیوں کے فرسودہ رسم ورواج، ان کے تعصبات اور مافوق الفطرت عقائد دور کرنے اور ان کے اندر ایک نئے فکر و عمل کی جلا بخشنے میں کافی مدد ملی[1]
چنانچہ ہندوستانی دانشوروں نے کئی اصلاحی مہم شروع کیں اور اپنے خیالات و افکار کی اشاعت کے لیے ہندوستان میں مختلف مقامات پر مختلف انجمنیں قائم کیں۔ مثلاً برہمو سماج، آریہ سماج، تھیوسوفیکل سوسائٹی، نام دھاری سکٹ، رام۔ کرشن مشن وغیرہ۔ جنہوں نے ہندوستانی سماج میں عورتوں کو ایک خاص مقام دلانے کی مہم شروع کی۔

غرض انیسویں صدی میں ہندوستان میں اصلاحات کی تحریکیں کافی زور و شور سے چل نکلیں۔ اور اس تحریک میں جہاں مردوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، وہاں عورتوں نے بھی اس کو آگے بڑھانے میں مدد دی۔ گرچہ ایسی عورتوں کی تعداد بہت کم تھی، لیکن ان کی موجودگی سے عام ہندوستانی عورت کو ایک نئی طاقت ملی اور روز بروز ایسی عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ مہارانی تپسوینی، پنڈتہ رامابائی، رام سورن دیوی، رانی شرنومئی، رانا بائی راناڈے وغیرہ جیسی مشہور شخصیتوں نے تعلیم نسواں کی تحریک کو ایک نئی زندگی بخشی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیم نسواں کی تحریک چند EDITE عورتوں نے شروع کی۔ لیکن ان کے اثرات بہت کم تھے۔ کیوں کہ ان کے وسائل بہت محدود تھے۔ اوّل تو لڑکیوں کے اسکول کی تعداد بہت کم تھی۔ اس کے علاوہ تربیت یافتہ اُستانیوں کی بے حد کمی تھی اور مردوں کو لڑکیوں کے اسکول میں پڑھانے کی ممانعت تھی۔ حکومت کا رویہ بھی تعلیم نسواں کے لیے بہت سازگار نہیں تھا۔ لیکن بیسویں صدی کے آغاز تک اس میں کافی تبدیلی آئی۔ لوگ اس کی اہمیت کو سمجھنے لگے اور ترقی یافتہ ریاستوں مثلاً بڑودہ، میسور، ٹراونکور میں اس کی پیش رفت میں اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ جس علاقے کے برطانوی افسران نے اس میں ذاتی دلچسپی لی وہاں خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ تعلیم یافتہ مستورات کی تعداد فیصد آبادی کے لحاظ سے ٹراونکور میں سب پر فوقیت رکھتی تھی۔ اسی طرح بڑودہ اور مدراس میں بھی لڑکیوں کے اسکول قائم ہوئے۔

جس وقت ہندوستان میں تعلیمِ نسواں کی تحریک شروع ہوئی تھی، اس وقت دیگر

---

[1] ایم کے پنکروی فاؤنڈیشن اور نیو انڈیا لندن ۱۹۶۳ء ص ۱۲۰

ممالک میں بھی عورتوں کی فلاح و بہبود اور ان کی سماجی و تعلیمی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش جاری تھیں۔ کسی کسی ملک میں تو ان کی حیثیت کو تسلیم کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ اسلامی ممالک کی تحریک تعلیم نسواں کا خاطر خواہ اثر ہندوستان کی مسلمان عورت کے لیے ایک ایسا ماحول فراہم کیا، جس سے ان کی تعلیمی تحریک کو ایک نئی طاقت ملی۔ اخباروں اور رسالوں میں ہندوستانی مسلمان عورتوں کے درد مندانہ مضامین اور اپیلیں شائع ہوئیں۔ جا بجا کانفرنس اور زنانہ اجلاس کا انعقاد کیا جانے لگا تاکہ مسلمان عورتوں کو تعلیمی ترقی کے لیے تیار کیا جا سکے۔ ان کے اندر ذہنی بیداری پیدا کی جا سکے۔ اسی طرح کی درد مندانہ اپیل رسالہ "خاتون" ۱۹۰۵ء میں شائع ہوئی۔ جس میں عورتوں سے تعلیم حاصل کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔

"اے میری معزز بہنوں کیا تم نے اپنی حالت پر غور نہیں کیا کہ ہماری زندگی کیسے بسر ہو رہی ہے ...... ہم کیسے جہالت کے اندھیرے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور نکلنے کی ذرا کوشش نہیں کرتے۔ پیاری بہنوں اب وہ وقت نہیں رہا کہ ہم صرف امورِ خانہ داری کو بری بھلی طرح انجام دے کر اچھی بیوی کہلا سکیں ...... بہت سی باتیں ہمیں انگریزیت کی سیکھنی چاہئیں۔ دیکھو انگلینڈ کی لیڈیاں کیسی عزت پا رہی ہیں صرف علم کی بدولت .... اب ہمیں چاہیے کہ ظاہری نمائش صرف فضول زیوروں اور کپڑوں کی محبت دل سے نکال کر علم کی محبت حاصل کریں۔" [1]

چنانچہ عورتوں کی تعلیمی حالت کا یہ نقشہ بیسویں صدی تک رہا کیوں کہ سر سید نے سب سے پہلے مردوں کی طرف اپنا سارا زور مرکوز رکھا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ تعلیم نسواں کے مخالف تھے۔ دراصل سر سید نے مسلمانوں میں جدید تعلیم خصوصاً انگریزی تعلیم کی تحریک اس وقت شروع کی جب مسلمان انگریزی تعلیم سے بدظن تھے اور ان کی سماجی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ خواتین کی تعلیم کے لیے کوشش کرتے۔ کیوں کہ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ جب تک مرد تعلیم یافتہ نہیں ہوں گے، عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں کی جا سکتی اور حقیقت بھی ہے کہ

---

[1] بحوالہ "خاتون" ۱۹۰۹ء ص ۱۰۰

دنیا میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ مرد تعلیم یافتہ نہ ہوں اور عورتیں تعلیم یافتہ ہو جائیں۔ چنانچہ جب سرسید کی تعلیمی تحریک کے زیرِ اثر مردوں کا ایک گروپ پڑھ لکھ کر تیار ہوا تو عورتوں کی جہالت اور اُن کے فرسودہ خیالات کے خلاف تحریک شروع کی۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی کہ اس وقت جدید تعلیم و تہذیب سے آراستہ مردوں کے لیے پڑھی لکھی عورتوں کی بے حد کمی تھی۔ تعلیم یافتہ مردوں کی ازدواجی زندگی اس تعلیمی فرق سے ناخوش گوار ہو رہی تھی۔ اس مسئلے پر اردو کے مشہور ادیب سجاد حیدر یلدرم نے ایک مضمون لکھا تھا۔ جو مئی ۱۸۹۹ء میں "معارف" (علی گڑھ) میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں انہوں نے اس وقت کے نوجوان کے جذبات کی بہترین ترجمانی کی ہے:

> "اس زمانے کا ہر ایک تعلیم یافتہ نوجوان شادی سے یہ پُر لطف خواب دیکھتا ہے کہ اس کی شریکِ حیات رنج و راحت اس کے برابر یا اس سے کچھ کم ہی تعلیم یافتہ ہے۔ وہ گھر کی ملکہ ہے جس کی سلطنت میں قدم رکھتے ہی وہ اپنی تکلیف کو بھول جانا چاہتا ہے .... مگر شادی ہونے کے بعد یہ واقعات سامنے آتے ہیں اور وہ بدنصیب یہ دیکھتا ہے کہ تعلیم یافتہ ہونا تو درکنار، جہالت کی وجہ سے گھر کی ملکہ اور خادمہ میں سوائے لباس اور صورت کے کوئی فرق نہیں۔" [۱]

دراصل سجاد حیدر یلدرم ہندوستانی مسلمان عورتوں کی زندگی میں بیداری اور روشن خیالی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کے جن خاص پہلوؤں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ان میں سے ایک مسلم خواتین یا لڑکیوں کی تعلیم کا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب شیخ عبداللہ نے مسلمان عورتوں میں تعلیمی تحریک شروع کی تو سجاد حیدر نے ان کی اس کام میں پوری مدد کی۔ ۱۹۰۴ء میں جب شیخ عبداللہ نے عورتوں کی تعلیم کے لیے ایک رسالہ تمدن جاری کیا تو اس کا نام "خاتون" سجاد حیدر نے ہی تجویز کیا اور بعد میں بھی اس تحریک اور اس رسالے کی سرپرستی کرتے رہے۔ ان کے اس دَور کے طبع زاد یا ترکی

---

[۱] سجاد حیدر یلدرم چند ابتدائی تحریروں کی روشنی میں: ڈاکٹر قمر رئیس ۱۹۸۲ء ص: ۸
بحوالہ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں اردو ناولوں کا حصہ ۱۹۹۱ء ص: ۱۰۸

سے ماخوذ افسانوں اور ناولوں کا ایک اہم موضوع عورتوں کے مسائل اور اُن کی تعلیم سے متعلق تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز میں مسلمان عورتوں کی تعلیمی تحریک کے سب سے بڑے محرّک اور مجاہد شیخ عبداللہ تھے جن کی عملی کاوشوں سے نہ صرف تعلیم نسواں کو فروغ حاصل ہوا بلکہ ان کے اندر ایک ذہنی بیداری پیدا ہوئی۔ وہ تعلیم نسواں کے بہت بڑے حامی تھے۔ ۱۸۸۶ء میں جب سر سیّد نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی تو اس کی ایک شاخ تعلیم نسواں کی حمایت کے لیے ۱۸۹۰ء میں قائم کی گئی، جس کے سکریٹری شیخ عبداللہ تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے اس پلیٹ فارم سے تعلیمِ نسواں کی تحریک کو آگے بڑھایا۔ اُنھوں نے ۱۹۰۴ء میں عورتوں کے لیے ایک رسالہ جاری کیا جس کا نام "خاتون" تھا۔ جس میں تعلیم نسواں کے متعلق مضامین شائع کیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ کانفرنس کی رودادیں بھی تفصیل کے ساتھ شائع کی جاتی تھیں۔ اُنھوں نے ۱۹۰۶ء میں لڑکیوں کا ایک اسکول بھی علی گڑھ میں قائم کیا۔ اس کام میں اُن کی بیگم بھی پیش پیش تھیں۔ اِنھیں اس اسکول کو قائم کرنے میں بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے اور اس تحریک کا مذاق بھی اُڑایا گیا، لیکن اُنھوں نے ان صعوبتوں کو نہایت صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کیا اور جلد ہی اُنھیں بیگم بھوپال کی حمایت اور سرپرستی بھی مل گئی۔

بیگم بھوپال بذاتِ خود ایک تعلیم یافتہ خاتون تھیں اور بالخصوص تعلیم نسواں میں گہری دلچسپی رکھتی تھیں۔ اُنھوں نے خود بھی اپنی ریاست میں لڑکیوں کا ایک اسکول قائم کیا تھا۔ وہ شیخ عبداللہ کی کاوشوں اور کارگزاریوں سے بہت متاثر ہوئیں اور اُنھوں نے علی گڑھ گرلس اسکول کے لیے ماہانہ رقم مقرر کر دی اور لڑکیوں کی رہائش کے لیے بھی اچھی خاصی رقم عطیہ کی شکل میں دی۔ بعد میں حکومتِ برطانیہ نے بھی اس رقم کے برابر گرانٹ اِن ایڈ منظور کی اور ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیم نسواں کی تحریک کا منظم آغاز ہوا۔ اس تحریک کے پیشِ نظر شیخ عبداللہ نے انجمن خواتینِ اسلام کی بنیاد رکھی اور "آل انڈیا مسلم لیڈیز کانفرنس" کا قیام عمل میں آیا۔ جس سے نہ صرف تعلیم نسواں کے فروغ میں کافی مدد ملی بلکہ ہندوستانی مسلم خواتین کو ایک پلیٹ فارم پر یکجا کرنے اور اُنھیں ایک پریشر گروپ بنا کر عورتوں کی ترقی و بہبودی کے لیے صحت مند رائے عامہ تیار کرنے میں ایک موثر تعاون حاصل ہوا۔

مولانا آزاد بھی تعلیم نسواں کے حامی تھے انھوں نے اس کی اہمیت اور ضرورت پر بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں کئی مضامین لکھے اور ماہنامہ "علی گڑھ" میں ایک مضمون ۱۹۰۳ء میں شائع کیا جس کا عنوان تھا "تعلیم ہماری قوم میں کیوں کر ہو سکتی ہے" اس میں انھوں نے ان سماجی رکاوٹوں کی نشان دہی کرنے کی کوشش کی جو تعلیم نسواں کی راہ میں حائل تھیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"ہم صاف صاف کہتے ہیں اور اسے قطعی فیصلہ سمجھ لو کہ جب تک پردہ ہندوستان سے نہیں اُٹھے گا جب تک عورتوں کو جائز آزادی جس کا اسلام مجوزہ ہے نہ دی جائے گی۔ غلامی میں رہ کر پردے کی تقلید کے ساتھ تعلیم دینی نہ صرف فضول بلکہ مضر اور اشد مضر ہے۔"[1]

تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں انفرادی کوششیں بھی جاری تھیں اور ان کوششوں کی وجہ سے ہندوستان میں تعلیم یافتہ مسلم خواتین کا ایک گروہ پیدا ہوا۔ جس نے تعلیم نسواں کے فروغ کے لئے گراں قدر کارنامہ انجام دیا اور اپنی تصنیف و تالیف سے خواتین میں بیداری، آزادی اور اصلاح کی ایک لہر سی دوڑا دی۔ ان میں سلطان جہاں بیگم، عطیہ بیگم فیضی، فاطمہ بیگم، صغریٰ ہمایوں کے ذکر کے بغیر ہندوستان کی تعلیمی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔

سُلطان جہاں بیگم:

سلطان جہاں بیگم کا نام ہندوستان کی تعلیمی ترقی میں ہمیشہ محفوظ رہے گا جس طرح سرسیّد نے مردوں کی تعلیم کے لیے تحریک چلائی اسی طرح سلطان جہاں بیگم نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے نہ صرف اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے ماحول کو سازگار بنانے کی کوشش کی بلکہ ان تمام تحریکوں کی سرپرستی اور مالی امداد بہم پہنچائی۔ اُنھوں نے مسلمان لڑکیوں کے لیے مدرسہ سلطانیہ بھوپال میں قائم کیا تھا اور ہندو لڑکیوں کے لیے پرجہیر کنیا پاٹھ شالہ قائم کی اور مدرسہ

---

[1] ادبی مجلہ ۱۹۸۲ء بحوالہ ہندوستانی تعلیم و ترقی میں اردو والوں کا حصہ ص ۱۱۵

آصفیہ بھی قائم کیا۔ جس میں ڈاکٹری اور طبِ یونانی پڑھائی جاتی تھی۔ وہ خود بھی تصنیف و تالیف کے کاموں میں حصہ لیتی تھیں۔ اُنھوں نے تقریباً ۲۳ کتابیں تصنیف کیں جو کمالِ تحریر کا بہترین نمونہ ہیں۔

عطیہ بیگم فیضی:

یہ سب سے پہلی مسلم خاتون تھیں جنھیں انگریزی حکومت کی طرف سے لندن جاکر تعلیم حاصل کرنے کا وظیفہ ملا۔ چنانچہ ۱۹۰۲ء میں اُنھوں نے لندن جاکر ٹیچر ٹریننگ حاصل کی اور عورتوں کی تعلیمی اصلاح اور آزادیٔ نسواں کے لیے بے پایاں خدمات انجام دیں۔

نفیس دلہن:

طبقۂ نسواں کی اصلاحی تحریک خصوصاً تعلیمِ نسواں اور آزادیٔ نسواں کی بڑی حامی تھیں۔ اُنھوں نے مسلم لیڈیز کانفرنس کی سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا اور وہ بیگم بھوپال کی شرکا رکار بھی تھیں۔ اُنھوں نے وقتاً فوقتاً عورتوں کے جلسے سے خطاب کیا اور اُنھیں تعلیم کی اہمیت سے روشناس کیا اور "نقشِ وفا" کے نام سے ایک کتاب بھی شائع کی۔

فاطمہ بیگم:

اوائل عمری سے ہی لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اور شریف بی بی نام کا ایک زنانہ رسالہ بھی مرتب کیا اور طبقۂ نسواں کی حمایت میں کئی مضامین لکھے اور ایک مدّت تک بمبئی میں انسپکٹر آف اسکول کے عہدے پر مامور رہیں۔ اخبار خاتون ان کی سرپرستی میں شائع ہوتا تھا۔

صُغریٰ ہمایوں:

اپنے عہد کی ایک مشہور مصنفہ اور سماجی اور تعلیمی تحریک کی ایک سرگرم رکن تھیں۔ اُنھوں نے تعلیمِ نسواں کی ترقی میں نہ صرف عملی قدم اٹھائے بلکہ اس موضوع پر کثرت سے ناول

اور مضامین لکھے۔ ان کی سرپرستی میں ایک نسوانی رسالہ "زیب النساء" بھی شائع ہوا۔

الغرض ہندوستان کی مسلمان عورتیں بھی اپنی معاشرتی اصلاح تعلیمی ترقی اور سماجی حیثیت کو بلند کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں اور ان میں ایسی ایسی نامور خواتین پیدا ہوئیں جنھوں نے طبقۂ نسواں میں بیداری کی لہر دوڑا دی۔ مثلاً فاطمہ زہرا بیگم بلگرامی، عباسی بیگم، خجستہ اختر سہروردی، موتی بیگم، خجستہ سلطان بیگم، مہدی بیگم، اختر حمیدہ، سلطان خانم، جہاں آرا، شاہنواز، رضیہ مسعود الحسن، بیگم شیخ عبداللہ وغیرہ کی کاوشوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے ہندوستان کے مختلف حصوں سے رسالے جاری کیے گئے۔ ۱۸۸۰ء میں لکھنؤ سے رفیق نسواں کے نام سے عورتوں کا پہلا رسالہ جاری ہوا۔ ۱۸۸۴ء میں سید احمد دہلوی نے اخبار النسا جاری کیا[1]

۱۸۹۶ء میں تہذیب نسواں لاہور سے جاری ہوا[2]

۱۹۰۰ء میں عبدالحلیم شرر نے ماہوار رسالہ "پردہ عصمت" جاری کیا۔

۱۹۰۴ء میں شیخ عبداللہ نے "خاتون" علی گڑھ سے جاری کیا۔

۱۹۰۹ء میں زنانہ ماہوار رسالہ "الحجاب" بھوپال سے جاری ہوا اور لاہور سے فاطمہ بیگم کی ایڈیٹرشپ میں شریف بی بی جاری ہوا۔

۱۹۰۸ء میں راشد الخیری نے عصمت جاری کیا اور پھر ۱۹۱۱ء میں اردو رسالہ "تمدن" جاری کیا جس میں خواتین کے حقوق کی حمایت میں مضامین لکھے جاتے تھے۔

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم نسواں کی تحریک کی نوعیت دو طرح کی رہی۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ جو جدید تہذیب و تمدن کا دلدادہ تھا۔ اور برطانوی نظام تعلیم کو بہتر سمجھتا تھا۔ اس نے مسلمان عورتوں کے لیے جدید تعلیم کی تحریک شروع کی۔ سرسید کا تعلق اسی گروپ سے تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے جدید علوم و فنون کو بہتر سمجھتے تھے۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ

---

[1] محمد حسین رضوی: اُردو کے علمی رسائل بیسویں صدی کے اوائل تھے۔ ص: ۴۴

[2] قرۃ العین حیدر: مسلم مسلم وومین آف انڈیا صد ۲۴
بحوالہ ہندوستانی تعلیمی ترقی میں ابتدائی ناول نگاروں کا حصہ۔ ص ۱۱۹

انگریز تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ قوم تھی۔ سولہویں سترھویں صدی میں ہی صنعتی انقلاب کے زیرِ اثر سائنس کی ایجادات، تعلیمی شوق و تجربے نے انھیں سربرآوردہ قوم ہونے کا فخر عطا کیا تھا۔ سائنس، ٹکنالوجی، علم و ہنر ہر میدان میں وہ ہندوستانی قوم سے سو سال آگے تھے لہٰذا یہ وقت کا تقاضا تھا کہ انگریزی تعلیم حاصل کی جائے جس کی ابتدا پچاس سال پہلے راجہ رام موہن رائے کر چکے تھے۔ اس مکتبِ فکر کے حامیوں میں شیخ عبداللہ، محسن الملک وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔

اس کے ٹھیک برعکس مسلمانوں کا دوسرا طبقہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو مسلمان عورتوں کے لیے تعلیم کی اہمیت کو مقدم تو ضرور سمجھتے تھے، لیکن وہ جدید تعلیم خصوصاً انگریزی تعلیم کی مخالفت کرتے تھے۔ اس مکتبِ فکر کے حامیوں میں راشد الخیری کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ "عصمت" میں زیادہ تر ایسے مضامین شائع ہوتے تھے جن کا تعلق عورتوں میں مذہبی تعلیم کا رجحان پیدا کرنا، خداوند کی بڑائی کو تسلیم کرنا اور پردہ کی اہمیت کو ماننا تھا۔ اس کے علاوہ ان تمام تحریکوں کو جن سے مسلمانوں کی مذہبی زندگی پامال ہوتی تھی ان کی مخالفت کرنا تھا اور مسلمانوں کو خصوصاً مسلم خواتین کو مذہبی تہذیب و تمدن کی چمک دمک سے دُور رکھنا تھا۔

چنانچہ جہاں تعلیمِ نسواں کے فروغ کے لیے مسلمانوں کے ایک گروپ نے عملی طور پر قدم اُٹھایا تو دوسری طرف مسلمانوں کے دوسرے گروپ نے تعلیمِ نسواں سے عام بیزاری اور بے حسی کو دُور کرنے کے لیے اپنی تحریروں خصوصاً ناولوں سے تحریک شروع کی۔ ان میں زیادہ تر ناول نگار وہ تھے جو سرسیّد کی تعلیمی تحریک سے یا تو منسلک تھے یا اس کے حامی تھے۔ ان میں خاص طور پر نذیر احمد، حالی، شبلی، شرر، محسن الملک، راشد الخیری کے نام لیے جا سکتے ہیں جنھوں نے اپنے ناولوں سے عورتوں کی تعلیمی و معاشرتی خامیوں کو دُور کرنے کی۔ ایک طرف تو انھیں اکتسابی تعلیم کے شوق کو بڑھانے کے لیے نئے نئے علوم سیکھنے کی ترغیب دی تو دوسری طرف ان کے اندر پیوست سماجی و معاشرتی خامیوں کو دُور کرنے کی کوشش کی۔ ان لوگوں نے مسلمان عورتوں کو یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی کہ تعلیم ہی وہ حربہ ہے جس سے انسان ساری برائیوں کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ تعلیم انسانی ذہن کو بالیدگی اور عقل کی روشنی عطا کرتی ہے۔ ان مصنفین نے اپنے ناولوں کے ذریعے

یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ تعلیم کسی مخصوص طبقے یا مخصوص جنس کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ سب کے لیے یکساں ہے اور عورتوں کے لیے یہ اس سے بھی زیادہ ضروری ہے کیوں کہ عورت ہی ہماری آئندہ نسلوں کی تہذیب و ترقی کا معیار ہے۔

سرسید کے رفقا میں جن حضرات نے تعلیم نسواں کی اہمیت پر زور دیا ان میں سر فہرست مولوی نذیر احمد کا نام لیا جاتا ہے۔ نذیر احمد اپنے عہد کے مکتبوں اور ان کے نصابوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ ان کتابوں سے جدید تعلیم حاصل نہیں کی جا سکتی۔ خصوصاً لڑکیوں کی حالت تو اور بھی قابلِ رحم تھی۔ کیوں کہ ان کے لیے اسکول کے دروازے بند تھے۔ ان حالات میں نذیر احمد نے لڑکیوں کی ایسی کتابیں تصنیف کرنا شروع کیں، جنھیں لڑکیاں شوق و دلچسپی سے پڑھ سکیں۔ اور اس پر عمل بھی کر سکیں۔ "مراۃ العروس" میں نذیر احمد نے اصغری کو ایک مثالی کردار کی شکل میں پیش کیا۔ اسی طرح "بنات النعش" میں اخلاقی تعلیم و تربیت کے ساتھ علوم جدیدہ کی افادیت اور معلوماتِ عامہ کی اہمیت پر زور دیا۔ انھوں نے تعلیم سائنس کے متعلق بھی معلومات فراہم کیں۔ مثلاً علم ریاضی، وزن، زمین کی کشش، ہوا کا دباؤ، مقناطیس، کششِ اتصال، زمین کی جسامت، جغرافیہ، کرۂ زمین، سمندر کے فوائد، علم تاریخ اور رسومات، اجرام فلکی اور علمِ ہیئت وغیرہ پر اپنی کتابوں میں تفصیل سے بحث کی۔ گو نذیر احمد اسلامی نظریات و عقائد سے متاثر ضرور تھے، مگر دوسری طرف ملک کی جدید سماجی، سیاسی اور تعلیمی تحریکات سے بھی بے نیاز نہیں تھے۔ وہ جدید تعلیم کو وقت کی ایک اہم ضرورت تصوّر کرتے تھے۔

نذیر احمد نے ۱۸۷۲ء میں "بنات النعش" لکھ کر مسلمان عورتوں کو ذہنی طور پر بیدار کر کے انھیں تعلیم کی اہمیت اور افادیت سے روشناس کیا۔ یہ کتاب "مراۃ العروس" کا دوسرا حصہ ہے کیوں کہ ان دونوں تصانیف میں ربط و تسلسل پایا جاتا ہے۔ اس میں نذیر احمد کے ان خیالات کا اظہار ملتا ہے کہ کیا صرف مذہبی تعلیم کے زیور سے عورتوں کو آراستہ کیا جانا چاہیے یا بدلتے ہوئے حالات کے مطابق انھیں جدید علوم و افکار سے بھی روشناس کیا جانا چاہیے تاکہ وہ اپنے بچّوں کی تعلیم و تربیت اپنے عہد کے مطالبات کے مطابق کر سکیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اس وقت نصابی کتابوں کی سخت قلّت تھی۔ اردو میں یا تو مذہبی کتابیں تھیں یا شاعری اور داستانوں کا ذخیرہ۔ چنانچہ اس عہد کی لڑکیوں کو

صرف ان ہی دو طرح کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کا موقع ملتا تھا۔ چنانچہ نذیر احمد نے اپنے عہد کی اس اہم ترین ضرورت کو پیشِ نظر رکھ کر لڑکیوں کی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے ہی "بنات النعش" کی تصنیف کی جو محض علمی معلومات کا ایک مجموعہ ہے۔ "بنات النعش" میں نذیر احمد نے اپنے تعلیمی تصوّرات کو نہایت ہی واضح طور پر پیش کیا ہے وہ ایک ایسے طریقۂ تعلیم پر یقین رکھتے تھے جس میں لڑکیوں کو زبردستی یا مار پیٹ کر تعلیم دینے کی گنجائش نہ ہو۔ بلکہ مکتبوں یا تعلیمی اداروں میں ایک ایسی فضا قائم کرنے کے حق میں تھے، جہاں لڑکیوں کے دل میں خود تعلیم پیدا کرنے کی خواہش پیدا کی جائے۔ کیوں کہ زور زبردستی سے تعلیم حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اصغری کے الفاظ میں نذیر احمد کے تعلیمی تصوّرات کو بہ آسانی سمجھا جاسکتا ہے:

> "خلافِ خواہش پڑھانا میرا دستور نہیں۔ پڑھنا پڑھانا تبھی فائدہ دیتا ہے جب پڑھنے والا خواہش کرے۔ ورنہ مارے پیٹے پڑھایا بھی تو کیا اوّل تو ایسا پڑھایا یاد نہیں رہتا۔ دوسرے جب دل نہ چاہا تو زبردستی کرتے سے اُلٹا ذہن کُند ہوجاتا ہے۔" [1]

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف نے پڑھائی کے سلسلے میں ایک اہم نفسیاتی نکتہ پیش کیا ہے۔ جسے آج بھی ماہرینِ تعلیم اہمیت دیتے ہیں اور جدید تعلیم میں بچّوں کو مار پیٹ کے بجائے کھیل کود PLAY WAY METHOD کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہے۔ دراصل نذیر احمد کا عہد اصلاحی تحریکوں کا عہد تھا۔ مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی، سماجی، سیاسی اور تعلیمی زندگی میں جو خرابیاں پیدا ہوگئیں، ان کے خلاف ہندوستان کی سرزمین پر کئی تحریکیں وجود میں آئیں۔ سیّد احمد شہید بریلوی نے ایک انقلابی اصلاحی تحریک کی ابتدا کی۔ جس کا مقصد مسلمانوں کو توہم پرستی سے، بے علمی اور روحِ اسلام سے لاعلمی کو ختم کرنا تھا اور انھیں خوابِ غفلت سے بیدار کرکے اسلام کی ان قدروں سے روشناس کرانا تھا جس سے مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی زندگی یکسر خالی ہوچکی تھی۔ سرسیّد کی تعلیمی تحریک مسلمانوں کے اندر ایک نئی روشنی پیدا کررہی تھی۔ اور اس تحریک نے انھیں زندگی کے تمام پہلوؤں کو نئے سرے

---

[1] بنات النعش بحوالہ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں ابتدائی اردو ناولوں کا حصہ۔

سے سوچنے اور غور و فکر کی طرف مائل کیا۔ اس وقت تک انگریز دلی کالج کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ جس طرح جان گلکرسٹ کے عہد میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا تھا اور جس کا مقصد انگریز حکام کو ہندوستانی مقامی زبانوں سے روشناس کرانا تھا۔ نذیر احمد نے اپنی زندگی کے آٹھ سال دلی کالج میں گزارے اور معلومات کی وسعت، رائے کی آزادی، تمثال ریشن اجتہاد، اعلیٰ بصیرت جیسی خوبیوں سے مالا مال ہوئے۔ چنانچہ جب انھوں نے دلی کے مسلمان متوسط گھرانے کی عورتوں کی زبوں حالی کا نقشہ دیکھا تو انھوں نے اپنی ساری توجہ ان عورتوں کی طرف متوجہ کردی جو جہالت کی تاریکیوں میں سانس لے رہی تھیں۔ عورتوں کی جدید تعلیم کو انھوں نے اپنی زندگی کا مقصد بنالیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے عورتوں کی روحانی، مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے ساتھ ساتھ علوم جدیدہ سے متعارف کرانے کی کوشش کی اور اس طرح ہندوستانی مسلمان عورتوں کو مشرقی و مغربی تہذیب و تمدن اور علوم و ہنر کی خوبیوں سے آراستہ کرکے ان کے اندر ایک نیا تصورِ حیات، ایک نیا اندازِ نظر اور ایک نئی بصیرت پیدا کی اور انھیں چمکنے اور نکھرنے کا موقع عطا کیا۔

نذیر احمد کی طرح حالی نے بھی اپنے عہد کے سماجی، مذہبی اور تعلیمی مسائل پر غور و فکر کیا تھا۔ انھوں نے تعلیمِ نسواں کی اہمیت اور اس کی ضرورت پر پوری توجہ دی جب کہ سرسید احمد اور ان کے دوسرے معاصرین اور رفقاء نے اصلاحِ نسواں اور تعلیمِ نسواں کو زیادہ ضروری نہیں سمجھا۔ ان لوگوں نے مردوں کی تعلیم پر زیادہ توجہ دی۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ جب مرد تعلیم حاصل کرلیں گے تو وہ خود اپنی عورتوں کو پڑھالیں گے۔ مولانا حالی کا نظریہ کچھ اور ہی تھا وہ عورتوں کے لیے بھی موجودہ نصابِ تعلیم کو بے حد ضروری تصور کرتے تھے۔ کیوں کہ تعلیم کے بغیر عورتوں کی زبوں حالی کو دور نہیں کیا جاسکتا۔ بقول معین احسن جذبی:

> "حالی کے دل میں ہندوستانی عورتوں کے لیے جو ایک گہرا درد ہے وہ ہمیں اس دور کے کسی مصلح، مفکر یا شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا۔" [1]

اور یہ حقیقت بھی ہے کہ مولانا حالی نے ہمیشہ ان رجعت پسند خیالات کی مخالفت کی جن کا اظہار

---

[1] معین احسن جذبی۔ حالی کا سیاسی شعور ۱۹۵۹ء ص: ۱۳۴

اس عہد کے لوگ کرتے تھے کہ عورتوں کو صرف اتنی ہی تعلیم دینا چاہیے جس سے وہ گھر کی معمولی باتوں کو اچھی طرح برت سکیں۔ لیکن مولانا حالی عورتوں کو اس وقت کی مروّجہ تعلیم کی بہترین خوبیوں سے آراستہ کرنا چاہتے تھے تاکہ یہ مظلوم طبقہ صنفِ بدتر کی جگہ صنفِ برتر کہلا سکے۔ اس سلسلے میں حالی نے معرکتہ الآرا نظمیں لکھیں۔ مناجاتِ بیوہ اور چپ کی داد۔ حالی نے سب سے پہلے مناجاتِ بیوہ ۱۸۸۴ء میں لکھی اور اس نظم کے ذریعے بیوہ کے جذبات و احساسات کی عکاسی کی اور اُن تباہ کُن رسم و رواج اور ظلم و ستم کا نقشہ کھینچا ہے جن سے ہندوستانی عورتیں دوچار ہیں۔ دوسری نظم چپ کی داد ہے جو ۱۹۰۶ء میں شائع ہوئی تھی اور جسے حالی نے تعلیم نسواں کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالنے کے لیے کہا تھا۔ لیکن اس کے پس منظر میں اُنھوں نے ایک مظلوم عورت کی پوری داستان اس طرح بیان کی ہے کہ عورت کی المناک اور درد بھری زندگی کی پوری تصویر آنکھوں میں گھوم جاتی ہے۔ اور جسے پڑھ کر حالی کے دردمند دل کا اضطراب اور بے چینی کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تعلیم نسواں کے لیے کس قدر کوشاں اور بے چین تھے۔ اس نظم میں ان تمام بے رحمیوں اور ناانصافیوں کا ذکر ہے۔ جو مردوں نے عورتوں کے لیے روا رکھی تھیں۔ وہ اس لیے جاہل رکھی جاتی تھیں کہ کہیں وہ اپنے جائز حقوق سے واقف ہو کر مردوں کی برابری کا دعویٰ نہ کرنے لگیں۔

گزرے ہیں جگ تم پر کہ ہمدردی نہ تھی تم سے کہیں
تھا منحرف تم سے فلک برگشتہ تھی تم سے زمیں

دنیا کے دانا اور حکیم اس خوف سے لرزاں تھے سب
تم پر مبادا علم کی پڑ جائے پرچھائیں کہیں

ایسا نہ ہو مرد اور عورت میں رہے باقی نہ فرق
تعلیم پاکر آدمی بننا تمہیں زیبا نہیں

لیکن حالی عورتوں کو سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمہاری حق تلفیوں کا دَور ختم ہونے والا ہے۔ تمہاری اصلاح و تعلیم کے لیے تحریکیں شروع ہونے والی ہیں۔ اب لوگ بیداد

ہونے لگے ہیں۔ اگرچہ اُن کی راہوں میں بہت دشواریاں اب بھی حائل ہیں، لیکن اُنھیں کامیابی حاصل ہوگی۔ اور سچائی کی فتح ہوگی۔

نوبت تمہاری حق رسی کی بعد مدّت آئی ہے
انصاف نے دُھندلی سی اک اپنی جھلک دکھلائی ہے

گو ہے ہمارے حامیوں کو مشکلوں کا سامنا
بہرحال ہر مشکل یونہی دنیا میں ہوتی آئی ہے

اٹکے ہیں روڑے چلتی گاڑی میں سچائی کے سدا
پر فتح جب پائی سچائی نے ہی آخر پائی ہے

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کے روشن خیال طبقے میں تعلیم نسواں کی لہر دوڑ گئی تھی اور یہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ ہمدردان و حامیانِ ملک و ملّت تعلیم نسواں کی توسیع و اشاعت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ حالی ان سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

اے بے زبانوں بے لسبوں کے بازو وُ ل
تعلیم نسواں کی مہم جو تم کو اب پیش آئی ہے

یہ مرحلہ آیا ہے پہلے تم سے جن قوموں کو پیش
منزل پہ گاڑی ان کی استقلال نے پہنچائی ہے

ہے رائی بھی پربت اگر دل میں نہیں عزم درست
یہ ٹھان لی جب جی میں پھر پربت بھی ہو تو رائی ہے

یہ جبیت کیا کم ہے کہ اب حق ہے تمہاری پشت پر
جو حق بہ منہ آیا ہے آخر اُس نے منہ کی کھائی ہے

ان نظموں سے حالی کے جوش و خروش کا پتہ چلتا ہے جس کا اظہار انھوں نے تعلیم نسواں کی حمایت میں کیا ہے۔ حالی نے تعلیم کی حمایت میں نہ صرف نظمیں لکھیں بلکہ عورتوں کو علم و ہنر کی اہمیت سے واقف کرانے کے لیے ناول مجالس النسا بھی لکھا، جو ان نظموں سے پہلے یعنی ۱۸۷۴ء میں ہی شائع ہوا تھا، اس میں اُنھوں نے تمام اچھی چیزوں سے واقف کرانے کی کوشش کی، جن کی ضرورت بچپن سے لے کر بڑھاپے تک ہوتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جب مائیں جاہل ہوں گی تو لڑکیوں کی تعلیم و تربیت اچھی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اُنھوں نے اپنے اس خیال کو عورتوں تک پہنچانے کے لیے مجالس النساء کی تصنیف کی جسے بقول منشی دیا نرائن نگم:

"اس وقت ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم کو یہ کتاب اس قدر پسند آئی کہ اُنھوں نے لارڈ ناتھ بروک گورنر جنرل ہند سے سفارش کر کے مولانا حالی کو اس تصنیف کے صلے میں چار سو روپے کا انعام دلایا اور پنجاب میں لڑکیوں کے مدرسے میں یہ کتاب مدتوں چلائی جاتی رہی۔" [1]

گرچہ حالی نے مجالس النساء کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں اُنھوں نے لڑکیوں کی تعلیم کی افادیت اور اُس کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے اور دوسرے حصے میں انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ایک ماں اپنے لڑکوں کو کس طرح بہتر تعلیم دے سکتی ہے۔ اس طرح ناول کے دونوں حصوں کی ترتیب بھی حالی کے اس خیال کی ترجمانی کرتی ہے کہ وہ عورتوں اور لڑکیوں کی تعلیم کو بنیادی اہمیت دیتے تھے۔ مجالس النساء کے کرداروں کے ذریعے بھی اُنھوں نے اس خیال کا اظہار بار بار کیا ہے۔ مثلاً اُتو جی پہلی مجلس میں یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتی ہیں کہ عام طور پر لوگ لڑکوں کو پڑھانا لکھانا ضروری سمجھتے ہیں، لیکن لڑکیوں کی تعلیم و تربیت سے بالکل غافل رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لڑکوں پر جلتی کوشش کی جاتی ہے۔ اس

---

[1] بحوالہ صالحہ عابد حسین دیباچہ مجالس النساء، ۱۹۷۱ء

تناسب سے انھیں فائدہ نہیں پہنچا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ لڑکیاں جاہل رہتی ہیں اور جب مائیں پڑھی لکھی نہ ہوں تو لڑکوں کو بہتر تعلیم و تربیت نہیں دی جا سکتی۔ اس بات کو مولانا آتو جی کی زبان سے یوں بیان کرتے ہیں:

"بچوں کی مائیں اگر اس قابل ہوں کہ اپنے بچوں کو آپ ہی تعلیم دے دیا کریں تو اس ملک کے دن ہی پھر جائیں۔ شاید تم نے یہ نہیں سنا کہ فرنگیوں کے ملک میں ان پڑھ آدمی کہیں نام کو ڈھونڈے نہیں ملتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہاں پڑھے لکھے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہیں یا ان کو کسی فقیر کی دعا ہے کہ جہاں بچے نے ہوش سنبھالا اور خود بہ خود اس گیا۔ کچھ بھی نہیں فقط یہ بات ہے کہ ان کے یہاں لڑکیوں کو پڑھانے کا دستور قدیم سے چلا آرہا ہے۔ وہی لڑکیاں جب بیاہی گئیں تو انھوں نے اپنی اولاد کو آپ تعلیم کرنا شروع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں عورتوں میں عورتیں اور مردوں میں مرد سب ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں تم تو ایک بیٹیوں کو ہی کہتی ہو۔ میرے نزدیک بیٹی کیا بیٹا کیا۔ ماں کی تعلیم کے بغیر کسی کو آدمیت نہیں آسکتی۔"[1]

نذیر احمد کی طرح مولانا حالی نے مجالس النساء میں تمام اچھی باتوں کو یکجا کر کے پیش کرنے کی کوشش کی تاکہ عورتوں کے ذہن کو بیدار کیا جاسکے۔ دراصل حالی نے اس ناول کو اس عہد کی اکتسابی ضرورت کے مطابق لکھا اور اس زمانے کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا۔ حالی علم کی اہمیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"علم ایک ایسی چیز ہے جس کی بدولت ایک عورت لاکھوں کروڑوں مردوں کو اپنا تابع دار بنالے۔ دیکھو ہماری بادشاہ شہزادی ملکہ وکٹوریہ یہاں سے ہزاروں کوس بیٹھی اپنے علم کے زور سے بادشاہت کر رہی ہیں۔ بیٹا اگر تم ان کتابوں کو پڑھ لو تو گھر بیٹھی سارے ملکوں کی سیر کر لیا

---

[1] مجالس النساء ص ۲۲

کرو اور آسمان کے اوپر اور زمین کے نیچے اور دریا کی تہہ میں اور پہاڑ کی کھو میں جو کچھ ہے تم پر آئینہ ہو جائے گا۔" [۱]

غرض مولانا حالی جا بجا انگریزوں کی پڑھی لکھی عورتوں کی مثال دے کر مسلمان عورتوں کے سامنے ایک معیار پیش کرتے ہیں اور اُنھیں ان کی تعلیمی خوبیوں کو قبول کرنے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں۔ نذیر احمد کی طرح حالی نے بھی اپنے ناول مجالس النسا میں علومِ عامہ کی اہمیت سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً دوسری مجلس سے پانچویں تک زبیدہ خاتون کی ماں کی تعلیمی کوششوں کا تذکرہ کیا ہے کہ کس طرح زبیدہ کی ماں کھیل کے ذریعے زبیدہ کی تعلیم کرتی ہے جیسے ماہرِ تعلیم آج PLAY WAY METHOD سے منسوب کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی زبیدہ کی ماں وقتاً فوقتاً زبیدہ کو معلوماتی مضامین سے بھی آگاہ کراتی ہے۔ جیسے:

"تم یہ جانتی ہو کہ سورج روز کہاں سے آتا ہے اور شام کو کہاں چلا جاتا ہے۔" [۲]

اس طرح مصنف نے مسلمان عورتوں کو اس عہد کے نئے تعلیمی نظام سے باخبر کیا اور نہایت غور و فکر کے بعد اخذ کی ہوئی باتوں سے ان کے دائرۂ فکر کو وسیع تر کرنے کی کوشش کی گرچہ مجالس النسا ان کی ابتدائی کوشش ہے۔

"لیکن ان کی شخصیت اس میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔" [۳]

اُردو ناول نگاری کی ابتدا میں سرشار نے اردو ناول کو بڑی صحت مند اور پائندہ روایات دی ہیں اور نذیر احمد کی طرح داستانی روایات سے انحراف کر کے زندگی کی وسعت، گہرائی اور گیرائی کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا اور فسانۂ آزاد جیسا شاہکار اردو ادب کو دیا۔

---

[۱] مجالس النسا، ص ۴۲۔

[۲] " " ۴۰

[۳] صالحہ عابد حسین دیباچہ مجالس النسا،

جس کی حیثیت ایک سماجی دستاویز کی ہے جس میں سماج کے مختلف طبقے کے لوگ، ان کی زندگی اور ان کے ماحول کو نہایت خوبصورت اور دل کش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔
فسانۂ آزاد کے علاوہ سرشار نے کئی اور ناول تصنیف کیے جن میں جام سرشار، کامنی اور سیرِ کہسار بہت مشہور ہیں۔ نذیر احمد کی طرح سرشار بھی تعلیم نسواں کے حامی تھے، لیکن ان کے نزدیک تعلیم سے مراد یونیورسٹی ایجوکیشن نہیں تھی۔ کیوں کہ اس وقت مرد بھی تعلیم کی دوڑ میں کافی پیچھے تھے۔ ایسی صورت میں عورتوں کے لیے یونیورسٹی ایجوکیشن ممکن ہی نہ تھی۔ سرشار نے اپنے زمانے کی عورتوں کی تعلیم کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"ہندوستان میں ایسی شریف زادیاں کہاں نظر آتی ہیں جو زیورِ علم و فضل سے متحلی ہوں۔ علمی شائستگی سے متجلی ہوں۔ کسی کو فکر پوری و دال، کسی کو شوقِ تراش خراش اللہ اکبر۔ اس درجہ .... دنیا و مافیہا سے بے خبر ہندوستانیوں کا ادبار آٹھ آٹھ آنسو رلاتا ہے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہمدردوں کا جی جلتا ہے اور فرطِ جوش اور حبِّ وطن سے سینہ مثل ریگ ابلتا ہے۔ پرانے فیشن کے بزرگ اکثر لکیر کے فقیر ہیں۔ جدّت سے طبیعت نفور شائستگی کی باتوں سے منزلوں دور ......" [۱]

سرشار عورتوں کے لیے اتنی ہی تعلیم چاہتے تھے کہ وہ لکھ پڑھ سکیں۔ اور عملی طور پر بہترین بیوی اور ماں بن سکیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک اردو کے علاوہ عربی، فارسی پڑھنا، ضروری دینی لیاقت حاصل کرنا، نذیر احمد کی کتابوں اور ترک جرمنی علی بند اور اخلاق کاشی وغیرہ اخلاقیات پہ کتابوں کا پڑھنا، ساتھ ساتھ گھریلو کام مثلاً کھانا پکانا، سینا پرونا وغیرہ میں دست گاہ حاصل کرنا ہی عورتوں کے لیے معراجِ تعلیم تھا۔
عبدالحلیم شرر نے بھی ناول نگاری کی ابتدا ایک اصلاحی مقصدی تحریک کے سبب کی۔ وہ مسلمانوں کے زوال آمادہ تہذیب سے بے حد متاثر تھے۔ اس عہد میں ہندوستانی

---

۱ فسانۂ آزاد جلد اول ص ۲۶۶۔ بحوالہ رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری

مسلمانوں کی سیاسی، سماجی اور مذہبی زندگی پر ایک جمود طاری تھا۔ خصوصاً مسلمان عورتوں کی حالت اور بھی ابتر تھی۔ غلط رسم و رواج اور جہالت کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی یہ عورتیں نہایت ہی بے کسی کے عالم میں زندگی گزار رہی تھیں چنانچہ شرر نے جہاں ہندوستانی مسلمانوں کے قلب کو گرمانے اور تڑپانے کے لیے تاریخی ناول لکھے اور انہیں گزرے ہوئے مسلمانوں کے جاہ و جلال سے واقفیت کرائی۔ وہاں اُنھوں نے عورتوں کی حالتِ زار کو بہتر بنانے کے لیے معاشرتی ناول بھی لکھے۔ اور اُنھیں ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق منظم کرنے کی کوشش کی۔ شرر نے "بدرالنساء کی مصیبت" "آغا صادق کی شادی غیب داں دلہن اور طاہرہ جیسے ناول میں لکھنؤ کی زوال آمادہ تہذیب کو ناولوں کا موضوع بنایا۔ شرر رسم و رواج کے سخت مخالف تھے۔ یہاں تک کہ عورتوں کے مروجہ پردے کے بھی قائل نہیں تھے۔ وہ پردے کو ایک مہذب لباس کا نام دیتے تھے۔ لیکن یہ ہرگز برداشت نہیں کرتے تھے کہ پردے کے نام پر عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں قید کر دیا جائے۔ چنانچہ مروجہ پردے کے خلاف اُنھوں نے ایک مہم شروع کی اور اپنے اس خیال کی تلقین کے لیے ایک رسالہ پردۂ عفلت جاری کیا جس کے خلاف سخت بیزاری کا اظہار کیا گیا۔ اس طرح شرر نے جہالت کی برائیوں سے ہندوستان کی مسلمان عورتوں کو آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ غلط رسم و رواج کی جڑیں ہماری جہالت ہی میں پیوست ہوتی ہیں۔ لہٰذا اُنھیں دور کرنے سے ہی مسلمان عورتوں کی حالت بہتر ہو سکتی ہے۔ گویا شرر نے اپنے ناولوں کے ذریعے اپنے عہد کے ان رجحانات کی نشان دہی کی جیسے بیسویں صدی میں مسلمان عورتوں کی سماجی تبدیلیوں کے لیے اہم سمجھا گیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جن ناول نگاروں نے مسلمانوں میں تعلیم نسواں کی تحریک کی جڑوں کو مضبوط کیا۔ ان میں صغریٰ ہمایوں کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف تعلیم نسواں کی حامی تھیں بلکہ اُنھوں نے آزادیٔ نسواں کی بھی حمایت کی۔ اُنھوں نے ہندوستانی مستورات کی زبوں حالی، جہالت اور پس ماندگی کا بخوبی مطالعہ کیا اور ان کی حالتِ زار کو بہتر بنانے، نئی تعلیم سے آراستہ کرنے اور ذہنی غلامی سے نجات دلانے کی ایک تحریک شروع کی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شاد عظیم آبادی نے اپنے مکتوبات میں اُنھیں سرتاج خاتونِ ہند کہہ کر مخاطب کیا ہے[۱]

---

[۱] ڈاکٹر وہاب اشرفی۔ شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری

صغریٰ ہمایوں کی شخصیت بڑی پُرکشش تھی۔ انھیں بہ یک وقت کئی ادب میں دخل تھا۔ انھوں نے اپنے اس مقصد کے لیے ناول 'مشیرِ نسواں' خالص اصلاحی ناول لکھا۔ اس کے علاوہ افسانے بھی لکھے۔ سوانح اور سفر نامے بھی مرتب کیے۔ مضامین لکھے، شاعری بھی کی۔ ڈاکٹر علامہ اقبال نے ان کی ایک نظم پر اصلاح دی تھی[۵]

ان کے مضامین کا مجموعہ "مقالاتِ صغریٰ" بھی شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے صحافت کے میدان میں بھی قدم رکھا۔ اور حیدر آباد سے رسالۃ النساء کی ادارت سنبھالی۔ زیب النساء لاہور کی بھی آپ ایڈیٹر رہیں۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے ہمایوں نگر میں ایک زنانہ اسکول بھی قائم کیا۔ اور اپنی جائیداد میں سے ڈیڑھ لاکھ روپے اس اسکول کے لیے وقف کر دیے انھوں نے کئی انجمنیں بھی قائم کیں، جس کا مقصد عورتوں کے اندر تعلیم کی اہمیت کو فروغ دینا غلط رسم و رواج کو اکھاڑ پھینکنا اور عورتوں کی آزادی کے جذبے کو استقامت پہنچانا تھا۔ غرض عورتوں کی اصلاح اور ان کی تعلیمی تحریک کی تاریخ میں صغریٰ ہمایوں کا نام ہمیشہ روشن حروف میں لکھا جاتا رہے گا۔

ہندوستانی مسلمان عورتوں کی تعلیمی تحریک کو فروغ دینے میں مولوی بشیر الدین احمد، منشی ہادی حسین، سید احمد دہلوی، مرزا عباس حسین ہوش، محمدی بیگم وغیرہ کے نام کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ مولوی بشیر الدین نے اپنے والد نذیر احمد کی تقلید میں عورتوں کی تعلیمی اصلاح کے لیے کئی ناول لکھے، جن میں اقبال دلہن، حسنِ معاشرت، اصلاحِ معیشت اور لخت جگر نے کافی شہرت پائی۔ یہ تمام ناول مرآۃ العروس کے طرز پر لکھے گئے اور ان تمام ناولوں کا مقصد تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلمان لڑکیوں کو اعلیٰ معیار اور با اخلاق لٹریچر فراہم کرنا تھا۔

مختصر یہ کہ سرسید کی تحریک سے متاثر ہو کر جن فن کاروں، دانشوروں اور قلم کاروں نے مسلمان عورتوں کی تعلیمی اصلاح کی کوشش کی۔ ان میں اردو کے ابتدائی ناول نگاروں کا اہم رول ہے۔ ان ناول نگاروں نے جہاں عورتوں کی تعلیمی اصلاح کے لیے رائے عامہ تیار کی، وہاں انھوں نے ایسے معلوماتی ناول لکھے، جن سے اس عہد کی عورتوں کی نصابی

---

[۵] نصیر الدین ہاشمی۔ حیدر آباد کی نسوانی دنیا ص ۴۹

کتابوں کی ضرورت پوری ہوئی اور ساتھ ہی ان ناول نگاروں نے طبقۂ نسواں کو منظم کر کے اُنھیں اپنے حقوق منوانے کے لیے بیدار کیا۔ اس بیداری نے طبقۂ نسواں کے اندر انفرادی آزادی کی لہر پیدا کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان عورتوں کی ایک اچھی خاصی تعداد نے جدید تعلیم سے لیس ہو کر آزادیٔ نسواں کی تحریک کا آغاز کیا۔ اس موضوع پر اخبارات، کتابیں اور رسالے شائع کی جانے لگیں، جگہ جگہ نئی تنظیموں کی بنیاد ڈالی جانے لگی۔ لڑکیوں کے لیے اسکول قائم کیے گئے۔ اس طرح بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مسلم عورتوں کی صدیوں سے مسلم عورتوں کی صدیوں سے کچلی مسلی ہوئی زندگی میں تبدیلی کی ایک نئی لہر پیدا ہوئی جو آہستہ آہستہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئی اور جہاں تک اردو افسانے کا تعلق ہے، اردو میں مختصر افسانہ ناول کی طرح مغرب سے آیا اور اتنی تیزی سے پروان چڑھا کہ نثر کی تقریباً ساری تخلیقی اصناف پر حاوی ہو گیا۔ افسانے کے اس تیزی سے مقبول ہونے کا سبب یہ ھے کہ اس میں مغربی انداز کا افسانہ تو نہ تھا، لیکن داستان، کہانی اور حکایت کے روپ میں اس کی روایت بہت پہلے سے موجود تھی اور اس کے پنپنے، بڑھنے اور بار آور ہونے کے لیے ہمارے لیے زمین بہت پہلے سے ہموار تھی۔ اردو افسانے کی ابتدا ایک ایسے زمانے میں ہوئی جب ہندوستانی سماج میں سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی حیثیت سے خاصا انتشار سا پھیلا ہوا تھا۔ قومی رہنما اس انتشار سے گھبرا کر ملک میں نئی تحریکیں چلا رہے تھے اور ایک نئے نظام کی طرف سے محبت کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ وہ ملک میں ایسی اصلاح چاہتے تھے جن سے تعلیمی اور معاشرتی زندگی بہتر بن سکے اور ادیب بھی ادب کے ذریعے اس جدوجہد میں حصہ لے رہے تھے۔ یہی وہ دن تھے جب مختصر افسانہ اردو میں آیا۔ اور پریم چند نے اُردو افسانہ نگاروں میں اس بات کو سب سے پہلے محسوس کیا اور پڑھنے والوں کے دلوں میں ماضی کی عظمت اور اس کی روحانی صفات کی محبت پیدا کی اور انہیں وطن پرستی کا سبق سکھایا۔

یہ صحیح ہے کہ اردو میں مختصر افسانے کی ایجاد منشی پریم چند کا کارنامہ ہے، لیکن اس سلسلے میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ کوئی اہم اور دیرپا تحریک خواہ وہ ادبی ہو یا سیاسی، تمدنی ہو یا معاشرتی کسی ایک شخص کا کارنامہ نہیں ہوتی اور زمانے کی تاریخی ضرورتیں اور تاریخی

تقاضے اصل چیز ہیں اور اشخاص و افراد مع اپنے کارناموں کے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایسے بہت سے دوسرے عوامل و محرکات تھے جو بیسویں صدی کے شروع میں مختصر افسانے کو وجود میں لانے کا باعث بنے۔ اس ضمن میں ان امور کا ذکر کیا جا سکتا ھے۔

بیسویں صدی کے آغاز تک قصہ نگاری کی قدیم روایت مذہبی قصوں، اخلاقی حکایتوں، طلسماتی داستانوں اور جدید الوضع ناولوں سے گزرتی ہوئی اس منزل میں داخل ہو چکی تھی، جہاں مختصر افسانے کی پیدائش کوئی دشوار بات نہیں تھی۔

اُنیسویں صدی کے آخری سالوں میں اس کا قدیم داستانی اسلوب جدید ناول کے اسلوب میں ڈھل چکا تھا۔ اور اچھے بُرے ناول نے مختصر افسانے کے لیے ضروری تہہ زمین پہلے ہی فراہم کر دی تھی۔

اُردو کے علاوہ بعض دوسری ہندوستانی زبانیں اُنیسویں صدی میں ہی افسانے کے فن سے آشنا ہو چکی تھیں۔ ظاہر ہے اردو کی دنیا ہمسایہ اور ہم عصر زبانوں کی تحقیقات سے بہت دنوں تک بے خبر نہیں رہ سکتی تھی۔

مغربی افسانہ اپنی تمام تر خوبیوں اور رعنائیوں سمیت چیخوف اور موپاساں کی عظیم شخصیتوں سے وابستہ ہو چکا تھا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ اُردو کی دنیا اس فیضان سے محروم رہتی۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد جب زندگی کا ہر شعبہ تصادم کا شکار ہوا تو اسی دور میں اردو افسانہ اس عہد کا عکاس بن کر نمودار ہوا۔ بقول ڈاکٹر قمر رئیس: "واقعہ یہ ہے کہ اردو میں مختصر افسانے کا آغاز بھی ادب میں زندگی یا حقیقت کی تفسیر و ترجمانی کا مظہر تھا۔"[۱] یہ صحیح ہے کہ اس کی ابتدا میں پریم چند کی اہمیت مسلم ھے اور اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ پریم چند اردو میں مختصر افسانے کے بانی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان سے قبل دوسرے ادیبوں کے مختصر افسانے دلگداز، اودھ پنچ، معارف، علی گڑھ (ماہنامہ) خاتون، مخزن، الناظر، بیسویں صدی، لاہور اور دوسرے رسائل میں شائع ہو چکے تھے۔ ان لکھنے والوں میں علی محمود،

---

۱ ڈاکٹر قمر رئیس: اردو افسانے کی نصف صدی فروری ۱۹۷۵ء ص: ۱

بحوالہ اردو افسانہ سماجی و ثقافتی پس منظر ص: ۸۰

عبدالحلیم شرر، راشد الخیری اور عزمی دہلوی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اور پریم چند کے ساتھ یا ان سے کچھ بعد جن لوگوں نے اس صنف میں اپنے جوہر دکھائے اُن میں سلطان حیدر جوشؔ، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتحپوری کے نام سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ جس طرح پریم چند کے ابتدائی افسانوں کا مقصد قوم میں وطن کی محبت اور اس محبت میں سب کچھ نثار کر دینے کا جذبہ ہے۔ اسی طرح سلطان حیدر جوش کے افسانوں کی بنیاد اس جذبے اور احساس پر ہے کہ ہندوستانیوں کو مغربی تعلیم اور تہذیب کے فریب سے محفوظ رکھا جائے۔ سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں کا محرک رومانیت کا تصور اور ایک متوازن قسم کا احساسِ فن ہے۔ نیاز فتح پوری کے افسانوں میں اسی رومانیت کی زیادہ جذباتی اور والہانہ تصویریں نظر آتی ہیں۔ بے شک یلدرم اور جوش کے افسانے سر سیّد کی روشن خیالی اور اصلاحی مقصد سے براہِ راست متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں فرد کی آزادی کی خواہش بھی نمایاں ہے۔ فرسودہ تصورات اور رسومات سے بیزاری اور انسان دوستی کی آرزو بھی ہے، لیکن اس میں ابھی قوم پرستی، سیاسی آزادی اور خود مختاری کا عنصر داخل نہیں ہوا تھا اور اسی کمی کو پریم چند نے پورا کر دیا۔ اُنھوں نے قومی جذبات، سماجی تبدیلیوں اور ذہنی کشمکش کی ترجمانی کی اور اس طرح اُنہوں نے مختصر افسانے کو براہِ راست ہماری زندگی سے سلوٹ کر دیا۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جو پریم چند کو جدید اُردو افسانے میں اوّلیت کا امتیاز عطا کرتی ہیں

باب سوم

راشد الخیری کی ادبی خدمات

ناول نگاری :

ناول کا سب سے سادہ اور آسان تصوّر ایک نثری قصّہ کا ہے۔ ایسا نثری قصّہ جو حقیقت نگاری کا حامل ہوتے ہوئے واقعی حالاتِ انسانی کا بیان ہو۔ انسانی زندگی کے مختلف واقعات کا ایسا مرقع ہو جس میں وارداتِ قلب کی دونوں کیفیتوں خوشی اور غم کے اندرونی اور بیرونی تاثرات کی ترجمانی دلآویز الفاظ میں کی جائے۔ حقیقی حالاتِ انسانی کا بیان عام گفتگو اور ادبی تنقید میں نمایاں طور پر ناول کہلانے کا مستحق ہے۔

نذیر احمد، سرشار اور شرر ہماری ناول نگاری کی تاریخ میں فنی روایت کے پیش رو ہیں۔ اور پھر راشد الخیری، محمد علی طبیب، سجّاد حسین اس روایت کے پیرو اور علمبردار ہیں اور انھوں نے اس روایت کو زیادہ مستحکم بنانے کی خدمات انجام دی ہیں۔

راشد الخیری کے پورے فن کی بنیاد نذیر احمد کی دی ہوئی اس روایت پر ہے جس کا آغاز مرأۃ العروس اور بنات النعش سے ہوا۔ فرق صرف یہ ہے کہ نذیر احمد نے عورت کی اصلاح کو ایک وسیع تر اصلاحی پروگرام بنا کر پیش کیا اور راشد الخیری نے اس کی اصلاح کے ساتھ اس کی معاشی حیثیت کے بلند کرنے کا بیڑا بھی اٹھایا۔ نذیر احمد نے عورت کو اس کے مسائل کو ایک ایسے مصلح کی طرح دیکھا جو اُسے پورے معاشرتی نظام کا ایک حصّہ سمجھتے ہیں۔ اور معاشرے کی اغراض کی خاطر اس کی اصلاح کے خواہاں ہیں۔ اس کے برخلاف راشد الخیری نے عورت کے مسائل کو عورت کی نظر سے دیکھا اور اس کے دُکھ درد کو اپنا دُکھ درد سمجھ کر اس کا مداوا کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ان کی نظر عورت کی زندگی کے ہر پہلو پر گئی۔ اور اس طرح پہلی مرتبہ ہمارا ادب عورت کی معاشرتی حیثیت کا

صحیح مصور اور مفسر بننے کے علاوہ اس کی ذہنی اور جذباتی زندگی کا آئینہ دار رہا۔ یوں زندگی کا ایک ایسا گوشہ جس پر اب تک لوگوں کی نظر نہیں گئی تھی۔ ایک اچھے ادیب اور ناول نگار کے صحیح اور بار یک بیں مشاہدے کی وساطت سے جیتا جاگتا ہو کر سامنے آیا اس طرح ہماری ناول نگاری میں موضوع کی وہ تخصیص جس کی ابتدا سرشار نے کی تھی، عام ہونی شروع ہوئی۔

"راشد الخیری کے ناول یوں بظاہر نذیر احمد کی پیروی و تقلید اور ان کے مخصوص انداز کی صدائے بازگشت ہیں، لیکن حقیقت میں اُنھوں نے ہماری ناول نگاری میں خاص معاشرے یا گروہ کی ہمدردانہ حمایت کی روش کی بنیاد ڈالی اور کوئی بھی ناول نگار جب تک کسی خاص فرد، جماعت، گروہ یا معاشرے اور اس کے مسائل کے ساتھ صحیح ہمدردانہ تعلق پیدا نہ کر لے اور اُس کے غموں کو اپنے دل کا ناسُور نہ بنائے وہ اس تجزیاتی مشاہدے کی طرف مائل نہیں ہوتا جس سے اچھے ناول نگار کا واقعاتی پس منظر بنتا ہے۔ راشد الخیری کے ناول اس مخصوص نقطۂ نظر کے حامل اور ترجمان ہیں۔" لہ

نذیر احمد کی طرح ان کا خاص میدان بھی ہندوستان کی مسلمان عورت کی معاشرت ہے۔ راشد الخیری مشرقی روایات کے علمبردار تھے اور ان کے ناولوں کا مقصد مشرقی روایات اور تہذیب کی حفاظت کرنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بظاہر ان کی زندگی کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اصل میں اپنی قدیم تہذیب کو قائم و باقی رکھنے کا جذبہ ہی طبقۂ نسواں کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور چونکہ ماں کی گود بچے کا پہلا مدرسہ ہوتی ہے، اس لیے طبقۂ نسواں کی خدمت کو اُنھوں نے اپنا شعار بنایا۔ کیوں کہ اس کے ذریعے وہ ملک و قوم کی خدمت کر سکتے تھے اور چونکہ مغربی تہذیب کو جڑ سے اُکھاڑنے کے لیے گھر سے بڑھ کر کوئی موزوں

لہ

جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی لیے ان کے تمام ناولوں میں گھریلو زندگی محور اور مرکز کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں پورے سماج کی تبدیلیاں منعکس نظر آتی ہیں کیوں کہ سب سے پہلے یہ تبدیلیاں گھریلو فضا میں ہی پروان چڑھتی ہیں۔

راشد الخیری مشرق اور مغرب کی تہذیبی کشمکش کو ظاہر کرتے ہوئے مشرقی تہذیب کی پاسداری اس لیے بھی کرتے ہیں کہ وہ اس میں مذہبی قدروں کو چھپا ہوا دیکھتے ہیں۔ وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ مغربی تمدن کی وجہ سے مذہب سے بیگانگی بڑھ رہی ہے اور مذاہب سے بیگانہ ہونے کے بعد ان کے نزدیک کوئی بھی ترقی تنزل سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کو تاریخِ اسلام سے آشنا کرانے کے لیے انھوں نے تاریخی ناول لکھے اور اس قدر دلچسپ پیرائے میں لکھے کہ تفریحِ طبع کے ساتھ تاریخِ اسلام سے متعلق مفید باتیں بھی معلوم ہوتیں۔ یاسمینِ شام، محبوبہ خداوند، عروسِ کربلا، امین کا دم واپسیں اور شہنشاہ کا فیصلہ۔ ان ناولوں میں ابتدائے اسلام سے لے کر زوالِ بغداد تک کے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنے تاریخی ناولوں کو اپنے معاصرین کی طرح صرف داستانِ حسن و عشق، جنگ و جدال نہیں بنایا بلکہ کام کی باتیں تحریر کر کے اردو کے بہترین تاریخی ناول بناتے۔ ان کے تاریخی ناولوں اور افسانوں میں عورت کا کریکٹر سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ان کی یہ کوشش تھی کہ مسلمانوں کے سامنے ایسی خواتین پیش کی جائیں جو اخلاق و عادات و اطوار میں ان کی خواتین کے لیے قابلِ تقلید ہوں۔ یاسمینِ شام میں بلقیسا کا کریکٹر نہایت زبردست ہے۔ وہ ہر مصیبت کا سامنا کرتی ہے، لیکن وفاداری، شرافت اور اخلاق کی راہ سے اس کا قدم ہرگز نہیں ڈگمگاتا۔ یہی حال طرابلس کی حسینہ سفیریہ کا ہے۔

ان کے ناولوں کا مقصد تاریخِ اسلام کے متعلق ان غلط فہمیوں کو دور کرنا بھی ہے جو متعصب پادریوں اور عیسائی مورخوں کی گمراہ کن تبلیغ کی بدولت غیر مسلموں میں پھیل گئی تھیں۔ انھوں نے اپنے تاریخی ناولوں کے ذریعے مسلمانوں کے عروج کا اصلی سبب بیان کرنے کی نہایت کامیاب سعی کی ہے۔ انھوں نے اپنے تاریخی ناولوں میں پاک محبت اور بدکرداری کی داستان لکھنے کے ساتھ ہی تاریخِ اسلام کے وہ واقعات بھی بیان

کیے ہیں، جن کی صداقت سے دنیا کا کوئی مورّخ انکار نہیں کر سکتا۔ انھوں نے دکھایا ہے کہ مجاہدینِ اسلام کس طرح سرفروشانہ قربانیاں دیا کرتے تھے اور ساتھ ہی اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ مسلمان عورتیں کس دل اور گردے کی مالک تھیں اور کس طرح جنگ میں شریک ہوتی تھیں۔ انھوں نے اپنے قلم کے زور سے اپنے تاریخی ناولوں میں ایک تڑپ اور روح پیدا کر دی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تاریخِ اسلام کے ان واقعات کو بیان کرتے وقت ان پر اسلامی جذبہ طاری ہو جاتا تھا۔ جس کے اثر سے وہ مسلمانوں کے جوشِ ایمانی، ان کی جراُت اور جاں بازی کی مکمل تصویر پیش کر دیتے ہیں۔ راشد الخیری نے غم انگیز انداز میں طبقۂ نسواں کی زبوں حالی کا بیان کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قوم نے انھیں مصوّرِ غم کا خطاب دیا تھا اور بقول پروفیسر بدھسن:

"ٹریجڈی جذبات واحساسات کا مرقع ہے"۔ ۱؎

اس لحاظ سے مصوّرِ غم کے تمام غم انجام ناول اور افسانے مشرقی لٹریچر میں بے مثال ہیں۔ ان کے غم انگیز ناول اور افسانے انسانی جذبات کی اس قدر صحیح ترجمانی کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کی آنکھوں سے سیلابِ اشک جاری ہو جاتا ہے۔

علامہ نے نوبت پنج روزہ یا وداعِ ظفر میں شاہِ ظفر کی جو نوحہ خوانی کی ہے وہ مبالغہ آمیز نہیں۔ شاہِ ظفر جن کی سلطنت تباہ ہوئی، گھر لُٹ گیا۔ ایک قیدی کی حیثیت میں اپنے دو جوان لڑکوں اور بے گناہ پوتے کے قتل کی خبر سنتے ہیں اور خون کے آنسو رو دیتے ہیں۔

"زینت محل میرے پہلو میں بھی دل ہے پتھر نہیں۔ بہادر شاہ انسان ہے، جانور نہیں۔ مجھ کو سنبھالو میرا دل نکلا، میری جان چلی۔ میرے پیارے بچو جاؤ جاؤ بڈھا مجبور باپ جس کی تقدیر میں تمہارا صدمہ دیکھنا تھا، مجبور ہے"۔ ۲؎

دوسری کتابوں میں جہاں علامہ نے رنج و غم کا سماں پیش کیا ہے اور کسی ماں،

۱؎، ۲؎ عصمت: اگست ۱۹۶۴ء ص ۵۹،

بیوی، بیوہ، یا یتیم بچوں سے نوحہ خوانی کرائی ہے۔ اگرچہ وہ آج کل کی ذہنیت اور معاشرت کے لیے موزوں نہیں ہے، لیکن یہاں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ علامہ اس وقت اور اس مقام کی تصویر کھینچتے ہیں، جہاں اور جب لوگوں کی ذہنیت اس طرز ہی کو پسند کرتی تھی۔ ان کی نوحہ خوانی آج کی تقلید کے لیے نہیں ہے بلکہ وہ قدیم معاشرت کا ایک نمونہ پیش کرتی ہے۔

راشد الخیری نے اپنے زورِ قلم سے مکمل کامیڈی حصے میں بھی اس قدر غم کی مصوری کی ہے کہ بے ساختہ آنسو نکل آئیں۔ وہ اپنے کامیڈی کے پلاٹ کو بھی غم سے اس قدر لبریز کر دیتے ہیں کہ پڑھنے والے پر رقت طاری ہو جائے۔[۱]

مؤدہ کا پلاٹ ایک مکمل کامیڈی ہے۔ اس کے ۱۶ باب ہیں۔ حالانکہ اس میں علامہ نے لڑکی کے کردار کو لڑکے کے تضاد میں بہت اونچا کر دیا ہے۔ لیکن ان میں سے ۱۴ باب ایک عورت کی لاچاری اور مجبوری کی دردناک داستان ہیں۔ ان میں ایک مسلم گھرانے میں معصوم بچی کی پیدائش پر ناخوش گوار فضا کی تصویر۔ کنوارپتے کے زمانے میں لڑکی کی صحیح پرورش سے تغافل، باپ کی ناخوشی، نفرت اور اپنے لختِ جگر کو وبال سمجھنے کی نفرت انگیز کہانی ہے۔ لڑکی کو اپنے مال و متاع سے محروم کر دینے کے لیے عیاری کی شرمناک اور دل ہلا دینے والے کرشمے، شادی کے بعد وراثت سے محرومی، عورت پر خاوند کی زیادتی کی داستان۔ جبر و ظلم کی نوبت طلاق تک پہنچی اور اپنا سات مہینے کا بچہ لیے وہ ماری ماری پھرتی رہی۔ اور ایک شام جب وہ اپنے مُردہ بچے کو لیے قبرستان میں داخل ہوئی تو اُس نے ایک بُڈھے سے کہا جو بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔

"اس بچے کو دفن کر دیجیے۔"

بڈھا: "اور ہمارا کام ہی کیا ہے۔"

مؤدہ: مگر میرے پاس اس کا معاوضہ کچھ نہیں۔ میں اس بچے کو کفن بھی نہیں دے سکی۔

بڈھا: بس تو آگے بڑھ۔

مؤدہ: آپ مجھے زمین کھودنے کے اوزار دے دیجیے۔ میں خود دفن کر دوں گی۔

۱؎ راشد الخیری: تنقیدی مقالات۔ وقار عظیم ص ۱۳۰

بُڈھا : کُدال پھاوڑے کا کرایہ اور زمین کی قیمت دینی ہوگی ۔ نہیں تو چل یہاں سے ۔

" اب شام ہو چکی تھی ۔ نماز کا وقت تھا ۔ بچّے کی لاش ایک قبر پر رکھ کر مؤدہ نے وضو کیا نماز پڑھی اور مُردے کو لے کر چلی ۔ چاندنی رات تھی ۔ دریا سامنے لہریں لے رہا تھا ۔ کنارے پر پہنچی ۔ آسمان کی طرف دیکھ کر کہا ۔ " کیا کروں ؟ " کوئی دفن نہیں کرتا ۔ اتنا کہہ کر مؤدہ نے بچّے کا مُنہ کھول کر پیار کیا اور دریا میں پھینک دیا اور بآوازِ بلند کہا ۔ اللہ اکبر ! اور آگے بڑھ گئی ! "

حالانکہ اس میں علامہ مؤدہ کو ایک جج کی مطمئن بیوی دکھلا دیتے ہیں جس کے قبضے میں اپنے پہلے ظالم شوہر کی عزت و ذلّت ہوتی ہے اور اپنے باپ اور بھائی کے ظلم کے بدلے میں وہ اچھے سلوک اور سعادت مندی کو اپنا فرض سمجھتی ہے اور اپنے خلوص و سچّائی کا ثمرہ پاتی ہے ، لیکن علامہ نے ہمیشہ اپنی تصنیف کے ذریعے اصلاحِ معاشرت عورت کے حقوق کی حمایت ، اسلام کے احکام کو چھوڑ کر رسوم قبیحہ کے پھندے میں گرفتاری اور اس کے خراب نتائج کے احساس کو قوم میں پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ اُنھوں نے اپنی کسی تصنیف کو محض ادبی کامیڈی یا ٹریجڈی بنانے کی ہرگز کوشش نہیں کی ۔ ان کی طرزِ نگارش حزنیہ ہے ۔ اس لحاظ سے کامیڈی ، ٹریجڈی یا اصلاحی تصنیف کوئی بھی ایسی نہیں جو اس طرز میں نہ لکھی گئی ہو ۔ راشد الخیری سوسائٹی کی اصلاح چاہتے تھے اور اس میں کامیابی کے لیے ضروری تھا کہ ایک مخصوص طرزِ تحریر اپناتے اور اُس کے لیے حزنیہ تحریر سے بہتر کوئی تحریر نہیں ہو سکتی تھی ۔ کیوں کہ وہ زیادہ دیرپا اور مؤثر ہوتی ہے ۔ حالانکہ ان پر یہ اعتراض ہے کہ ان کا طرز مصنوعی معلوم ہوتا ہے اور ہر جگہ حزن نگار بننے کے لیے حد درجہ غلو سے کام لیا گیا ہے [۱]

مگر قصۂ غم کے مقابلے میں مزاحیہ تحریر کا اثر دیرپا ہرگز نہیں ہوتا ۔ ان کی حزنیہ داستانوں کا ایسا کامیاب اثر خواتینِ اسلام پر پڑا کہ وہ خوابِ غفلت سے چونک پڑیں ۔ ان کو معلوم ہو گیا کہ وہ کیا ہیں ۔ اور ان کے ساتھ شرعاً کیسا سلوک ہونا چاہیے اور رواجاً کیا

---

[۱] عصمت ۱۹۳۶ء ص ۲۰۰

سلوک ہو رہا ہے۔ اور بظاہر علامہ کی زندگی کا مقصد بھی یہی تھا۔ اسی لیے اُنھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کی بنیاد غم پر رکھی تاکہ عورتوں کو غم کا احساس ہو اور وہ اپنے حقوق کو پامال ہوتا دیکھ کر خاموش نہ بیٹھی رہیں۔ بلکہ مصیبتوں اور ظلموں کا مقابلہ کر کے اس کا سدِّ باب کریں۔

راشد الخیری نے عورت کی آزادی کی ایسی راہ نکالی جو مغرب کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ مشرق کی معاشرت پر منحصر تھی۔ اُنھوں نے جہاں رسوم قبیحہ اور جاہلانہ عقیدوں اور اوہام کی مخالفت کی، وہیں اُنھوں نے مختلف مشرقی رسوم کو جو فرسودہ اور بے کار سمجھی جاتی تھیں جائز قرار دیا۔ اور ان کی اچھائیوں کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ جیسے وہ شادی کے موقع پر مایوں کی رسم کو اس لیے ضروری قرار دیتے ہیں کہ اس میں لڑکی کو تنہائی میں اپنے مستقبل کے بارے میں غور کرنے کا موقع ملتا ہے۔ پھول کی رسم کو وہ اس لیے جائز قرار دیتے ہیں کہ اس سے باہمی محبت و اخوت بڑھتی ہے۔ پردے کے متعلق وہ بتاتے ہیں کہ اس نے مسلمانوں کو اچھی بُری لاج اور تھوڑا بہت بھرم رکھ لیا ہے۔ اس طرح اُنھوں نے مشرقی رسم و رواج میں بہت سی خوبیاں ڈھونڈ نکالی تھیں۔ اس طرح مغربی زندگی کو رد کر کے اُنھوں نے مشرقی تہذیب کی بہتری اور برتری کو ہر ممکن طریقے سے ثابت کیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اُنھیں یہ یقین بھی تھا کہ وہ ایک ایسی جنگ لڑ رہے ہیں جس میں ان کی ہار یقینی ہے۔

"مغربی سیلاب اور طرزِ جدید کی رو اندھادھند اُمڈتی چلی آ رہی تھی اگر دنیا کے تمام سید زادے زور لگا دیتے تو یہ بھی یہ طوفان رکنے والا نہیں اور یہ پہاڑ ٹھہرنے والا نہیں تھا۔" [۱]

ایک دوسری جگہ وہ بتاتے ہیں کہ کس طرح وہ عروس مغرب کی شاہانہ سواری نہ صرف دُلہنوں کو رنگِ حنا سے محروم کر دے گی بلکہ بہارِ مشرق کا لباس خزاں ہو جائے گا۔ اس طرح اُنھوں نے اپنے ناولوں میں ہندوستانی زندگی کے ایک بہت اہم موڑ کی نشاندہی کی اور سرابِ مغرب کے مقابلے میں جوہرِ قدامت کی اصلیت اور حقیقی چمک دمک کو ظاہر

---

[۱] سرابِ مغرب ص ۱ بحوالہ بیسویں صدی میں اردو ناول ص ۱۲۶

کیا لیکن اس مقصد کی پیش کش میں وہ اس درجہ منہمک ہو گئے کہ اُنھوں نے ناول کے فن کے مطالبات کو نظر انداز کر دیا۔ [1]

راشد الخیری اپنے ناولوں کے ذریعے سماج کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے اُنھوں نے عورتوں کی تربیت اور ان کی بنیادی تعلیم کو اہمیت دی۔ کیوں کہ وہی کل کی مائیں تھیں اور ماں کی گود بچے کا پہلا مدرسہ ہوتی ہے اور انسان کی زندگی کے بارے بارے میں سارے تصورات کی تشکیل کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ناول میں مقصدیت ایک اہم مقام رکھتی ہے بلکہ اس صنفِ ادب کا مقصد ہی بعض کے نزدیک انسان کو بدلنا اور انسان کے ذریعے سماج کو بدلنا ہے، لیکن ایسے نقاد بھی جو ناول میں مقصد کو سب سے اہم ترین مقام دیتے ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ

"جب کبھی ناول عملی طور پر تبلیغ کرنے لگتا ہے تو ہم اس کی تخلیقی حقیقت پر اعتماد کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔" [2]

راشد الخیری کے ناول عورت کی مظلومیت کی داستان ہیں۔ مگر ان کے اصلاحی جذبے، ان کے تبلیغی انداز، ان کی خطابت، ان کی جذباتیت، ان کی اُکتا دینے والی یکسانیت راشد الخیری کو اس میدان میں کوئی بڑا درجہ نہیں دینے دیتی۔" [3]

"شامِ زندگی" ان کی سب سے مقبول اور نمائندہ تصنیف ہے۔ یہ ناول، ۱۹۱۷ء میں لکھا گیا۔ جب کہ ان کا اندازِ فکر اور ناول نگاری کا اسلوب پختہ ہو چکا تھا۔ اس کتاب کی وجہ سے اُنھیں مصورِ غم کا لقب بھی ملا تھا۔ علامہ جتنی شدت سے لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرتے ہیں وہ اس میں پوری طرح نمایاں ہے۔ اس ناول کی ہیروئن اپنی بندوں رابعہ اور ہاجرہ کو بتاتی ہے کہ بھونچال کیا ہے۔ توہمات اور غلط تصورات سے کیا نقصان ہوتے ہیں۔ بچوں میں توہمات کس طرح پرورش پاتے ہیں۔ بچوں کی تربیت

---

[1] بنت الوقت ص ۴۷، بحوالہ بیسویں صدی میں اردو ناول ص ۱۲۶

[2] The Novel Today ص ۳۰۷

[3] اردو نثر کا فنی ارتقا ص ۱۱۰ بحوالہ بیسویں صدی میں اردو ناول ص ۲۶۳

کس طرح کرنا چاہیے۔ غرض پورے گیارہ صفحوں کا ایک لکچر ہے اور دوسرے موقع پر ہاجرہ کے سامنے سائنسی معلومات پر ایک تقریر ہے۔ اس کے بعد ہی نسیمہ محلے کی ایک انجمن میں میاں بیوی کے تعلقات کے متعلق سات آٹھ صفحوں پر پھیلی ہوئی تقریر کر ڈالتی ہے۔ اور جب رابعہ اور اُس کے شوہر میں رنجش پیدا ہوتی ہے تو نسیمہ رابعہ کو چار صفحات پر مشتمل ایک نصیحت کرتی ہے۔ جانے سے پہلے اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں عورت اور مرد کے حقوق کے تعلق سے نسیمہ کی ایک تقریر ہوتی ہے اور پھر بچوں کی پرورش پر نو صفحات پر مشتمل ایک لکچر ہوتا ہے۔ اس طرح ایک سو چالیس صفحات کے ناول میں پچاس ساٹھ صفحے صرف لاست تقریروں، وعظوں اور نصیحتوں کی نذر ہو گئے ہیں۔ صبحِ زندگی میں بھی ہر جگہ نصیحتیں اور تقریریں ملتی ہیں۔ اس کے ساتھ بال بڑھانے کے نسخے پانی صاف کرنے کے طریقے، مختلف کھانے پکانے کے طریقے اور کپڑا کاٹنے کے نقشے تک دیے گئے ہیں۔ یہاں پہنچ کر قاری کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ وہ ناول پڑھ رہا ہے یا فنِ خیاطی کے بارے میں کوئی کتاب۔ مقصد کا اس طرح اُبھر کر آنا ناول کی ایک ایسی خامی ہے جس کو وہ نقّاد بھی مستحسن قرار نہیں دیتے جو ناول میں کسی خاص مقصد کی اشاعت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ رائف فاکس اشتراکی ادیب ہے، لیکن وہ بھی یہی کہتا ہے کہ:

> "مصنّف کا کام وعظ کرنا نہیں ہے بلکہ حقیقی زندگی کی تصویر کشی کرنا ہے۔" [۱]

اس وعظ و نصیحت کے ساتھ بعض باتوں کو راشد الخیری بڑی تکرار کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ نذیر احمد کے ناول "مرآۃ العروس" کی راشد الخیری کے تقریباً ہر ناول میں ایک اچھے کردار کے مقابلے میں ایک بُرا کردار ملتا ہے۔ صبحِ زندگی میں نسیمہ بیگم

---

[۱] The Novel and The People Page: 138

بحوالہ بیسویں صدی میں اردو ناول ص ۱۳۸

کے مقابلے میں منجھلی بیگم کا کردار آتا ہے۔ شامِ زندگی میں نسیمہ ہی کے کردار کے مقابلے میں اس کی جٹھانی کا کردار پیش کیا گیا ہے۔ جوہرِ قدامت میں ناہیدہ کے برعکس شاہدہ کا کردار ہے اور سنتوشی میں منوّر کے برعکس حادثہ کا کردار ملتا ہے۔ سوکن کے جلاپے میں محمودہ کے مقابلے میں آمنہ کا کردار ہے اور شبِ زندگی کے حصّہ اوّل میں وسیم دُلہن کے مقابلے میں نسترن اور شبِ زندگی حصّہ دوم میں فاطمہ کے مقابلے میں ثریّا کا کردار پیش کیا گیا ہے پھر ان کے اچھے کرداروں کی صفات بالکل ایک جیسی ہوتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا شوہر پرست ہونا ساس کی خدمت کرنا، انتہائی غریب مظلوموں کی مدد کرنا۔ فراخ حوصلہ، سخی اور اسلامی احکام کی پابندی کرنا بالکل لازمی اور ناگزیر ہے اور ان کے خراب کردار ان کے اچھے کرداروں کے بالکل برعکس ہوتے ہیں۔ جس طرح ان کی اچھائیاں مخصوص ہیں اسی طرح ان کی برائیاں بھی مخصوص ہوتی ہیں۔ راشد الخیری کی ناول نگاری بالکل مقصدیت کے تابع رہی ہے۔ اس لیے ناول کی پوری فضا اس کے مطابق ڈھلتی ہے۔ ان کی ناول نگاری پر ڈاکٹر شائستہ اختر کا یہ اعتراض ہے کہ:

> "ان کے ناول اوسط حالات کو اجاگر نہیں کرتے۔ ان کے تمام ناول کسی سماجی برائی کے گرد گھومتے ہیں۔ کردار اس کی اضافت سے دکھائے جاتے ہیں۔ وہ یا اس مخصوص سماجی برائی کو قائم رکھنے والے ہوتے ہیں یا اس کا شکار جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کردار کی شخصیت کا واضح تصوّر سامنے آتا ہے۔ وہ انسان بننے سے زیادہ کسی خیال کا مجسمہ بن کر رہ جاتے ہیں۔" [۱]

راشد الخیری کے کردار جو کسی خیال کا مجسمہ بن کر سامنے آتے ہیں۔ اس کی بڑی

---

۱ A Critical Survey Of The Development Of Urdu Novel and Short Story Page: 107

وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خود اپنی مخفی صفات کو ان کرداروں کے ذریعے بار بار پیش کرتے ہیں۔ غریبوں سے ہمدردی اور یتیموں کی خدمت ایسی صفت ہے جو ان کے ہر اچھے کردار میں دیکھی جا سکتی ہے۔ غریبوں اور یتیموں کی امداد کا جذبہ خود ان کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھا۔ مصنف نے اپنے ذاتی خیالات کو ناول میں پیش کرنے کے تعلق سے سامرسٹ نے بڑی اہم بات کہی ہے کہ ناول نگار کو اپنی زندگی کے حقائق ناول میں اس وقت پیش کرنے چاہئیں جب کہ وہ کردار سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتے ہوں۔ اگر وہ کردار نگاری کے معیار پر پورے نہیں اترتے تو ان حقائق کو کاٹ کر پھینک دینا چاہیے"۔ [۱]

راشد الخیری اپنی زندگی کے حقائق کو کہیں بھی پھینکتے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ وہ کسی نہ کسی طرح ان کو اپنی کردار نگاری میں صرف کر ڈالتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی ناول نگاری میں یکسانیت آگئی ہے۔

بہر حال ان کی ناول نگاری کے کئی فنی نقائص ہیں جن کی وجہ سے ناول کے ہر نقاد نے ان کے ناولوں پر اعتراض کیے ہیں۔ علی عباس حسینی ان کے ناولوں کو حقیقت کے ترجمان نہیں بلکہ تبلیغی رومان کہتے ہیں۔ [۲]

سہیل بخاری بھی ان کی رائے سے متفق ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر مجموعی اعتبار سے راشد الخیری نے ناول کو ترقی دینے میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا۔ لیکن زبان و بیان کے لحاظ سے اُن کے ناول ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

افسانہ نگاری:

راشد الخیری کو افسانہ نگاری کا فن اپنے پھوپھا نذیر احمد سے ورثے میں ملا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں تمثیلی انداز زبان کا دہلوی رنگ اور فکر کا وہ

---

[۱] Summing P.132 بحوالہ بیسویں صدی میں اردو ناول ص:

[۲] ناول کی تاریخ و تنقید ص ۲۴۳

مخصوص دھارا جو نذیر احمد کے تمثیلی قصّوں سے مخصوص تھا، مختصر افسانے میں ڈھل گیا۔ لیکن اپنی انفرادی شان اور منفرد اسلوب لیے ہوئے راشد الخیری نے جب قلم سنبھالا تو انگریزی سامراج کا آفتاب عالم، علما، فضلا، سیاسی اور سماجی رہنماؤں کے سر پر چمک رہا تھا۔ ملک میں امن وامان قائم ہو چکا تھا۔ غدر کو ناکامی کے بعد رؤسا نے انگریزی سرکار کو ہی خدا مانا۔ جاگیرداری اور برطانوی سامراج کی سازباز کے بعد ملک میں جو تحریکیں شروع ہو گئی تھیں، ان کی نوعیت تین قسم کی تھی۔ ایک تو یہ کہ انگریزی راج سب سے اچھا راج ہے۔ اس میں خوبی ہی خوبی ہے۔ دوسری یہ کہ انگریزی راج سب سے خراب راج ہے (سیاسی اعتبار سے کم اور مذہبی اعتبار سے زیادہ) انگریزی پڑھنا گناہ ہے، انگریزی بولنا گناہ ہے، انگریزوں سے ملنا گناہ ہے، ہاتھ ملانا گناہ ہے۔ مغربیت ایک لعنت ہے۔ تیسری نوعیت وہ جو ان کے بین بین تھی اس میں مذہبی اصلاح کے ساتھ سیاسی مراعات طلبی کا جذبہ تھا۔

راشد الخیری کے افسانوں میں رواں فکری دھارے کو ان کے مخصوص طریقۂ کار میں علی گڑھ تحریک کا ردِّ عمل خصوصاً سر سیّد احمد خاں کی تعلیمِ نسواں اور دینی مدارس کے ضمن میں بھی کہا جا سکتا ہے۔

اُنھوں نے بطور ایک سوشل ریفارمر اپنے افسانوں میں ایک مخصوص انداز کے ساتھ ترقیٔ نسواں اور ادبی، تمدّنی اور تہذیبی روایات کے تحفّظ کا جتن کیا اور مغربی فکر کے نتیجے میں پیدا ہونے والی زندگی کے اُمڈتے طوفان پر بند باندھنے کی کوشش کی جو ان کی نظر میں مشرقی عقائد و روایات کے لیے ضرر رساں تھا۔ اس کوشش میں ان کا مخصوص رنگ، مصلحانہ روش اور پند و نصائح سے ترتیب پاتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے ہم عصر پریم چند کی رائے نہایت اہم ہے۔ پریم چند لکھتے ہیں:

"اکثر مصلح اور مفکر ادیب پر غالب آگیا ہے، لیکن مولانا راشد الخیری حقائق سے اتنے قریب تھے اور ان سے اس درجہ متاثر ہوئے ہیں کہ ان کا ذہن فنی اصولوں کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بے شک دنیا آرٹسٹ کی محدود فکر سے

کہیں وسیع تر ہے۔ خدا کی دنیا اور انسان کی دنیا میں کوئی نسبت نہیں۔ خدا کی دنیا میں آئے دن ایسی صورتیں پیش آتی رہتی ہیں جنھیں انسان کی دنیا گوارا نہیں کر سکتی جو انسان کی فہم سے بھی بعید ہیں واقفیت چاہتی ہے۔ آرٹسٹ دنیا کو اسی طرح دکھائے جیسے وہ اُسے دیکھتا ہے اگر اس سے اس کے انسانی احساسات کو صدمہ پہنچتا ہے تو پہنچے۔ اگر اس سے اس کے حس انصاف کو چوٹ لگتی ہے تو لگے پر اسے واقفیت سے منحرف ہونے کی اجازت نہیں۔ مگر ادیب سب کچھ سمجھنے پر بھی آئیڈیلیسٹ بننے کے لیے مجبور ہے۔ جب تک اس کی نظر میں سوسائٹی کی اور کوئی بہتر صورت نہیں ہے۔ موجودہ معاشرت کی ناہمواریاں کیسے بیتاب کریں گی۔ جس کے لیے کسی اونچے آئیڈیل کا ذہن میں ہونا لازمی ہے۔ اور تنقید وہی کر سکتا ہے جو صحیح سے واقف ہو۔ ادب بھی تو تنقیدِ حیات ہے۔ اگر کسی بہتر زندگی اور زیادہ خوبصورت سوسائٹی کی صورت ہمارے ذہن میں نہیں ہے تو ہم موجودہ سوسائٹی کو کھینچ کر اصلاح کی کس منزل کی طرف سے لے جائیں گے۔ مولانا راشد الخیری آئیڈیلیسٹ تھے۔ ان کا آئیڈیل اسلام کا تمدنی دور تھا جب لوگوں کے دلوں میں خدا کا خوف تھا اور ایمان کی روشنی تھی۔ جب لوگ مہماں نواز تھے، آخرت پسند تھے۔ جب توحید اپنی خالص صورت میں جلوہ گر تھی، جب عورت کے حقوق سلب نہیں کیے گئے تھے اسے چار دیواری کے اندر قید نہیں کیا گیا تھا۔ جب وہ دینی مسائل پر رائے زنی کرتی تھی۔ جب وہ اپنے حقوق سے ہی آگاہ نہیں تھی بلکہ اپنے فرائض سے بھی باخبر تھی جو فی الواقع ایک مسئلے کے دو پہلو ہیں۔ لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب

وہ اپنے شوہروں کے دوش بدوش میدانِ جنگ میں جاتی تھیں۔
اور زخمی سپاہیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ جب وہ صحیح معنوں
میں خاندان پر حکومت کرتی تھیں۔ راشد الخیری کا آئیڈیل
وہی سُنہرا اسلامی دور تھا۔"[۱]

راشد الخیری کا وہ مخصوص رنگ جو مصلحانہ روش اور پند و نصائح سے تربیت پاتا ہے ان کے تمام افسانوں میں نمایاں طور پر جلوہ گر ہے۔

"اطالیہ اور اس کے حمایتیوں کو ڈوب مرنا چاہیے کہ مُٹھی بھر
خانما برباد ترکوں اور عربوں نے ان کا حلیہ بنا دیا۔ اب تمہارا
فرض یہ ہے کہ اسلام کی لاج رکھو اور اس سے پہلے کہ طرابلس
پر اطالیہ قابض ہو تم اپنے ملک و قوم پر سے قربان ہو جاؤ۔"[۲]

علم و عمل کی تلقین کے لیے اُنھوں نے نہ صرف پند و وعظ کی خشک مجلسیں ہی سجائیں بلکہ اُنھوں نے افسانوں اور کہانیوں کے پردے میں اچھے سبق دیے اور وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ وہ یورپ کی اندھا دھند تقلید کرنے والے، نئی روشنی کے رسیا خشک وعظ سننے کو ہرگز تیار نہیں ہوں گے۔ چنانچہ اُنھوں نے خشک سے خشک موضوع کو اپنے افسانوں کے رنگ میں دلچسپ بنا دیا۔ منازلِ ترقی میں مولانا ایک مقام پر نالائق اور ظالم مجسٹریٹ کے ظلم پر تنبیہہ کرتے ہیں۔ مجسٹریٹ کی خدا ترس نیک دل ماں اپنے ظالم بیٹے سے کہتی ہے:

"تجھے خبر ہے کہ اب ایک بے گناہ بے وارثی اور بے مددگار

---

[۱] راشد الخیری کے سوشل افسانے: مطبوعہ دہلی "عصمت" راشد الخیری نمبر جولائی ۱۹۳۶ء
بحوالہ اردو کا پہلا افسانہ نگار راشد الخیری ص ۱۰۶-۱۰۷

[۲]

عورت کا گھر تیرے حکم سے چھینا جا رہا ہے۔ تجھے علم ہے کہ تیرے ظلم نے ان یتیم بچوں پر ستم توڑ دیا جن کا وارث خدا کے سوا کوئی نہیں۔ میں واقف ہوں کہ زندگی کے فانی جلووں نے تیری آنکھوں پر پردے ڈال دیے ہیں۔ میں باخبر ہوں کہ ترقی کی جھوٹی اُمیدوں نے تیرا ایمان غارت کر دیا ہے۔.... شیطان تیرے سر پر دنیا تیرے دل پر اور نفس تیرے وجود پر سوار ہے لیکن ڈر اُس انجام سے لرز اُس نتیجے سے اور کانپ اُس وقت سے جو آنکھیں دیکھیں گی دل اُٹھائے اور جسم بُھگتے گا............ اور بدنصیب توبہ کر اور غافل نہ ہو اُس وقت سے جس کا نام موت ہے۔ تو نے سُنا اور میں نے سُنا یا کہ ایک مظلوم عورت ایک بیوہ عورت اور ایک بدنصیب عورت نے تیری آنکھوں کے سامنے تیرے کان کھول دیے اور تیری دہلیز کے اوپر محمدؐ کا واسطہ دیا۔ یہ وہ نام ہے جس کے اشارے پر تجھ جیسے ناہنجار کا بیڑا پار ہوتا ہے اے ذلیل انسان کس برتے پر پانی۔ مسلمان ہو کر اسلام کی یہ وقعت!"[۱]

شاعر ہو یا افسانہ نگار دونوں کی حیثیت رہنما اور رہبر سے کم نہیں۔ اپنی مافی الضمیر سے لوگوں کو خبردار کرنا اس کا فرض منصبی ہے۔ علامہ قومیت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور جب اُنھوں نے دیکھا کہ مغربی تہذیب نے ہمارے افراد و قوم کے دل و دماغ کو مسخر کر لیا ہے تو وہ تڑپ اُٹھے۔ ان کا احساسِ دل بزرگوں کے کارناموں کو زندہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اُنھوں نے بزرگوں کا ذکر افسانہ سمجھ کر نہیں کیا بلکہ

۱؎

تاریخ کا ایک ورقِ زریں سمجھ کر پڑھا اور دوسروں کو سنایا۔

.......میدانِ ترقی کے بہادرو! یہ سفید داڑھیاں، یہ متبرک صورت جو عنقریب صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائیں گی۔ آج تمہارے راج میں بے وقوف سہی، جاہل سہی، لکیر کے فقیر سہی، مگر ان کی عمر کے پچھلے ورق تو اُلٹ کر دیکھو زمانے کا رُخ بدل جائے گا۔ ہوا کے جھکڑ چل جائیں گے۔ ان کے کارنامے مٹنے والے نہیں۔ ان پتھروں سے محبت اور مروت کے ایسے چشمے پھوٹے ہیں کہ راستہ چلتے مسافر مگن ہو گئے......

.........آنے والی نسلیں سُن لیں کہ ہم ان بزرگوں کی اولاد ہیں جن کے قدموں میں خلق و تہذیب کے دریا پھوٹتے تھے۔ زمانہ ان واقعات سے فسانہ بنائے گا۔ مگر یہ کہانیاں بہت روز تک باقی رہیں گی۔[۱]

راشد الخیری نے جب ان اگلے لوگوں کی بازیافت چاہی تو بہ یک وقت کبھی مسلم اجتماعی لاشعور کی طرف نکل گئے۔ مثلاً عدلِ گلبدن؛ عدلِ جہانگیر، مامون الرشید کا دربار، آمنہ بنت اظہر اور اُمّ جعفر کی عید اور کبھی ماضی قریب کے مغلیہ خاندان کی سمت تابناک مسلم ماضی سے طاقت حاصل کرنے کی مثال، ان کے دو افسانوی مجموعوں دلّی کی آخری بہار اور غدر کی ماریاں شہزادیاں کے وہ ستائیس افسانے ہیں جو ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۷ء کے درمیان لکھے گئے۔ ان افسانوں میں خصوصیت کے ساتھ شہزادی زہرہ بیگم کی داستان، شہزادی مہ جبیں دلہن کی سرگزشت، مینا بازار، حمید مخبر، لو اقمر، بھکاری شہزادی، جھولے کی یاد، لال داڑھی والے مرزا صاحب اور بہادر شاہ کی بھانجی سند کے قدموں پر یادگار افسانے ہیں۔ علامہ نے یہ افسانے ایسے دردبھرے الفاظ میں لکھے ہیں کہ اُنھیں پڑھ کر آنکھیں تو کیا دل بھی رونے لگتا ہے۔ ان کے افسانوں کا ہر باب سوز و گداز سے بھرا ہوا ہے۔ ایک مقام پر ان کا قلم یوں اشکبار ہوتا ہے:

۱؎ لوگوں سے اقتباس

بحوالہ راشد الخیری تنقیدی مقالات: وقار عظیم ص: ۱۰۲

"میری وہ راتیں جو میلے میں بسر ہوئیں زندگی کی بہترین راتیں تھیں۔ شہزادیاں بھی بادشاہ اور قلعہ کو اتنا نہ روئی ہوں گی جتنا میں دلی اور دلی والوں کو رو رہا ہوں .... ستم بر ستم یہ ہے کہ رونے والے بھی نہ رہے اور میری آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے اُٹھ گئے ہیں۔ راتوں میں رونے والوں کا ہمنوا تھا۔ آج تنہا ہوں اور کوئی اتنا نہیں جو میرے آنسوؤں کی ہاں میں ہاں ملائے۔" [1]

"دل رو رہا تھا، مگر آنکھ خاموش تھی۔ کائنات سو رہی تھی لیکن چاند مصروفِ کار تھا۔ مہندیوں کا وسیع میدان کوسوں زندہ انسان کا نشان نہیں۔ دلی کا مشہور قبرستان ہے۔ مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کا مقتدر خاندان اسی سرزمین میں پر بڑھاپے کی سفیدی سے بدلی ہے۔ بارہا میتوں کے ساتھ بھی اور فاتحہ خوانی کی غرض سے بھی جانے کا اتفاق ہوا ہے، مگر آج تک اس چبوترے پر چڑھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ تاریخ جس وقت مملکتِ علوم کے ان تاجداروں اور مذہبِ اسلام کے ان خدمت گزاروں کی حکومت اور خدمت سامنے لاتی ہے تو جسم کانپ جاتا ہے اور اقلیمِ سخن کے ان شہنشاہوں کا جلال پاؤں میں زنجیر بن جاتا ہے۔" [2]

علامہ راشد الخیری کے افسانوں میں رواں فکری دھارے میں سیاسی رنگ کی شمولیت ایک منفرد ذائقے کا باعث بنی۔ ایک زمانے میں مولانا محمد علی جوہر

---

[1] بیلہ میں میلہ سے اقتباس: بحوالہ راشد الخیری تنقیدی مقالات: وقار عظیم ص ۱۰۳

[2] بیلہ میں میلہ سے اقتباس: بحوالہ اردو کا پہلا افسانہ نگار راشد الخیری ص ۱۲۰

اور حکیم اجمل خاں نے اُنھیں سیاست کی طرف لانے کی بہت کوشش کی، مگر اُنھوں نے جلسے جلوس میں جانے سے معذرت کرلی، لیکن اُنھوں نے سیاسی پلیٹ فارم کی ہنگامہ آرائیوں سے الگ رہ کر بھی اپنا کام کیا۔ لہٰذا جنگ طرابلس ترکی کے بٹوارے کرنا اور رلٹ کے مسلم قتلِ عام سے متعلق شہید مغرب طرابلس سے ایک صدا جیسے افسانے لکھے اور جلیان والا باغ کے خونِ ناحق سے متعلق سیاہ داغ ہندو مسلم کشیدگی سے متعلق کلونتیاں اور افراط و تفریط جیسے افسانے لکھے اور یقیناً ان کے یہ افسانے وہ کام کر گئے جو بڑے سے بڑے سیاسی اکابرین نہ کر سکے۔ اس نوع کے افسانوں کی وہ خوبی جو ایک تمثیلی اور علامتی انداز ہے جو راشد الخیری کے افسانہ کلونتیاں کا آغاز انگریزوں کی مکاری کا تمثیلی بیان ہے۔

"سات سمندر پار کا رہنے والا ایک پردیسی سیّاح وارد ہوا ملکہ کو دیکھا اور علاج شروع کیا............ اعلانِ شاہی کے مطابق معالج ثریا کا جائز حق دار تھا........ افسوس اور قلق اس بات کا ہے کہ پردیسی سیّاح بھی جن کے ساتھ انسانیت کے لمبے لمبے اور چوڑے چوڑے دعوے تھے، یہاں کا رنگ دیکھ کر اُسی ڈھرے پر چل پڑے..... .... خاندانِ شاہی کے افراد رنگ دیکھ کر چوکنے ہو گئے لیکن سانپ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ سانپ کی طرح سر دُھنتے اور تقدیر کو روتے۔"

راشد الخیری نے پہلا علامتی افسانہ سارس کی تارک الوطنی لکھا جس میں جانور انسانی مظالم کی کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ اور افسانہ چھہار عالم علامت نگاری کے باب میں اوّلین اہم سنگِ میل ہے۔ اختتام کی چند سطور ملاحظہ ہوں:

"اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ وہ کلیجے کا ٹکڑا جس کو کفن میں لپیٹ کر گھر سے وداع کیا تھا صاف شفاف اُجلے براق

کپڑے پہنے دروازے میں کھڑا ہے۔ بیتاب ہوگئی۔ دل بلبلا اُٹھا اور چیخ اُٹھی اور کہنے لگی آ آ میری جان اندر آ۔

بچے نے ماں کی صورت دیکھی۔ جھک کر سلام کیا اور وہیں کھڑا کھڑا کہنے لگا۔
اماں جان میں اندر نہیں آسکتا۔ میرے پاؤں ننگے ہیں تمہارا بچھونا خراب ہو جائے گا۔
ارے بچھونا قربان صدقے جاؤں تو اندر آ . . . .

قدیر اب مُنہ سے کچھ نہ بولا۔ دونوں پاؤں دکھائے۔ لہولہان تھے۔
"سات رُوحوں کے اعمال نامے اور سنتوشی میں تمثیل اور علامات کا مِلا جُلا استعمال ملتا ہے"

افسانہ سنتوشی میں افضال (خاوند) مغرب پرستی اور اُس کی بیوی منوّر مشرقیت کی علامتیں ہیں۔ لیکن جنّت کا طریقۂ کار تمثیلی انداز لیے ہوئے ہے۔ راشد الخیری سے متعلق یہ تاثر غلط ہے کہ ان کے مزاحیہ اور طنزیہ افسانے شدید الم پسندی کے ردِ عمل کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ افسانہ دریائے مقصود مصوّرِ غم کا پہلا افسانہ ہے جس میں ظرافت کی چاشنی پائی جاتی ہے۔ ولایتی نتھی، نانی عشو اور دادا لال بجھکڑ اس ضمن میں شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ جب کہ سات رُوحوں کے اعمال نامے کو بھی اس ضمن میں شمار کیا جا سکتا ہے اور دادا لال بجھکڑ کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شریفانہ مزاج اور سنجیدہ شوخی کیا چیز ہے۔ اس افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:
"فقرہ پورا نہ ہوا تھا کہ ایک بُرقع والی دالان میں داخل ہوئی ڈبیہ تڑسے اس کے مُنہ پر لگی۔ ادھر لڑکے نے جو زور سے پنکھا جھلا تو وہ دادا کی آنکھ میں جا گھسا۔ ادھر بٹوا جو سر پہ پھینکا

تھا اس سے ٹکرایا۔ باوا آدم علیہ السلام کے زمانے کی رسّی ہو رہی تھی
چھینکا اور سالن کی رکابی سر پر آئی۔ داڑھی نے گالوں سے خوب
ہولی کھیلی اور مرچیں آنکھوں میں پہنچیں۔ ادھر آنکھ میں گھسا پنکھا
ادھر داخل ہوئیں مرچیں اور سر پر پڑی رکابی۔ دادا سمجھے منڈی
ہوئی چھندیا پر دادی نے ٹھیکر دیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ بند
آنکھیں کئے بڑھا۔ ایک پھٹکر لٹکا ہی رہا۔ بے چاری بہ قبع پوش
"ہائے مری" کہہ کر بھاگی تو سمجھا کہ اب پٹا۔ وہ تیتری ہوا۔
.... دادا آنکھیں بند ہاتھ
سے ٹٹولتے ہوئے مٹکوں میں پہنچے کہ منہ دھوئیں۔ مٹکے کو ٹٹولا
وہ پہلے ہی تیڑھا رکھا تھا ہاتھ پڑتے ہی شہید ہوا۔ دوسرے
پہ ہاتھ ڈالا تو پانی کی بوند نہیں۔ دانت چبا کر بولے اری نامراد
پانی دے"۔ ؎

راشد الخیری کا افسانہ رویائے مقصود ایک اہم افسانہ ہے اور اس کے
مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ راشد الخیری کے افسانوں میں ڈرامائی عنصر خصوصی
مطالعے کا طالب ہے بقول احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں۔

"ان کی حزنیہ نگاری میں جو شدت ہے اس کے ساتھ جب
ان کی مکالمہ نویسی کی قابلیت و کمال سامنے آتا ہے تو حیرت
ہوتی ہے کہ وہ ڈرامہ نویس کیوں نہ ہوئے۔ میرا یقین ہے کہ اگر وہ
کسی زندہ قوم کے فرد ہوتے تو ان کی قوم ان سے ڈرامہ ہی لکھواتی۔
ہمارا ملک اگر قدر شناس نہ ہوتا اور مولانا نے ڈرامے کی طرف

؎ افسانہ دادا لال بھبکڑ
بحوالہ اردو افسانہ تحقیق و تنقید ص ۵۰

توجہ کی ہوتی تو وہ ہندوستان کے پہلے اور اوریجنل
ڈرامہ نویس ہوتے ہوتے بلکہ انھوں نے دنیا کے بڑے
بڑے ڈرامہ نویسوں کی صف میں جگہ پائی ہوتی۔"[۱]

یہ ڈرامائی عنصر راشد الخیری کے یہاں اکثر ان کے افسانوں کے آغاز میں دکھائی دیتا ہے۔ جب کہ افسانوں کا اختتام سکون یا منتہا تک پہنچتا ہے۔ ان کے افسانوں میں شاعرانہ نثر کے علاوہ باقاعدہ منظوم ٹکڑے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں اور ان منظوم ٹکڑوں میں ان کی منفرد اسالیب، بیان کی طاقت، تاثریت سے لبریز۔ بقول احمد اکبرآبادی:

"ان کے فنی محاسن و نقائص سے قطع نظر یہ ایک مبہم حقیقت ہے کہ ان کی تحریر اپنا مقصود و غایت حاصل کرنے کے لیے ناکام رہتی اور صناعت آرٹ میں یہ سب سے بڑی کامیابی ہے کہ صناع اپنا مقصود و غایت حاصل کر سکے۔"[۲]

اور ان کے مخصوص اسالیب کی سب سے بڑی خوبی تکلف و ابہام و اشکال سے پاک دلی کی بیگمات کی زبان ہے اور پھر برجستہ کہاوتیں، مثالیں اور محاورے جن کی مثال کہیں نہیں ملتی۔

"لڑکی کے کپڑے میلے چکٹ ہیں۔ کرتے میں پیوند، دوپٹے میں کھونپ، ہاتھ میں سوئی، گھٹنوں پہ کپڑا بے خبر بیٹھی سی رہی چشم بینا غور تامل کی اعانت سے اس ظاہری کثافت کی تہہ میں نفاست کے خزانے پوشیدہ دیکھ رہی ہے۔ اس کے ہاتھ

---

[۱] اُردو کا پہلا افسانہ نگار راشد الخیری ص ۱۲۶

[۲] "عصمت" راشد الخیری نمبر ص ۲۱۰

پاؤں، ناک کان، عارضی زیور سے لدی ہوئی نہ سہی مگر ایمان
رازداں دولت سے مالامال ہے۔ عفت وعصمت کا بیش بہا
زیور اس کے چہرے کو جگمگا رہا ہے اور گو عسرت وافلاس کی انتہا
ہے لیکن جوہرِ شرافت پر بیش بہا جواہرات قربان ہیں"۔ ؎۱

راشد الخیری کے تسلسل میں زبان کے زرتار سے کی سطح پر یہ پہلی بھرپور روایت ہے، جو جذباتیت، تصویریت، شعریت اور نغمگی سے مملو ہے پھر بھی ان کے افسانوں کا خمیر تضاد و تطابق، مبالغہ آمیزی، بڑھاپا اور ہوس ناکی سے اٹھایا گیا ہے اور نذیر احمد کی طرح ان کو بھی اپنے قصّے کی چلبن پر اعتماد نہیں تھا، اس لیے وہ براہِ راست وعظ پر اُتر آتے ہیں۔ حالانکہ وہ کسی کے مقلّد نہیں تھے، لیکن ان کا افسانہ خیالستان کی پری پریم چند کے دنیا کے سب سے انمول رتن کے براہِ راست اثر کا نتیجہ ضرور ہے۔ اور اسی طرح سودائے نقدیرِ یلدرم کے خارستان وگلستاں کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں، لیکن یہ کہنا انصاف نہ ہوگا کہ راشد الخیری کی تدبیر کاری اپنے معاصر افسانہ نگاروں سے جُدا ہے۔ وہ عموماً مبالغے، وفورِ جذبات اور طے شدہ مثالی انجام کو بالعموم دیگر فنّی وسیلوں اور رویوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ اصل میں وہ یہ نہیں طے کر پاتے کہ انھیں کیا کچھ ایک افسانے میں ہی بیان نہیں کرتا ہے۔ وہ بے موقع جذباتی ہو جاتے ہیں۔ دراصل انھوں نے افسانے ایک مشنری اسپرٹ سے لکھے اس لیے وہ اس امر کا خیال نہیں رکھ پائے کہ قصّے کے مرکزی تاثر کو شغف پہنچ سکتا ہے۔ وہ بے تکان اپنے پسندیدہ موضوعات پر نہ صرف تقاریر کراتے ہیں بلکہ تبصرہ کرنے کے ساتھ ساتھ براہِ راست خطاب شروع کر دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا کی نظر مسلم معاشرت کے سنگین پہلوؤں کی جانب تھی، مگر وہ اپنی مقصدیت کی دُھن میں تصنع اور مبالغے کے رنگ اس حد تک آمیزش کرتے ہیں کہ ان کے

؎۱ عدلِ جہانگیر سے اقتباس

بیشتر کرداروں کا عمل اور ردِ عمل حقیقی دنیا سے اپنا رشتہ توڑ بیٹھتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عابد حسین یہ جواز پیش کرتے ہیں:

"انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ جذبات پرستی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے لوگوں کے لیے آرٹ کی نزاکتوں کی نہیں بلکہ خطابت کے تیر و نشتروں کی ضرورت ہے۔" [۱]

یہ بجا ہے کہ راشد الخیری اپنے عہد کے مقبول اور اوّلین افسانہ نگار تھے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ آج ان کے افسانے کسی سنجیدہ قاری کو ترس رہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ انوار احمد یہ بتاتے ہیں:

"وہ اپنے کرداروں کو عموماً انجام سے پہلے تختی دے دیتے ہیں۔ بصورتِ دیگر انجام پر وہ اتنے بہت سے واقعات چند جملوں میں اس طرح ٹھونستے ہیں کہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں ہر کہانی ناول کا قالب مانگتی ہے۔ چند افسانوں کے سوا ہر افسانے کا انجام اس اعتبار سے عبرت ناک اور دردناک ہوتا ہے کہ برابر کردار عذابِ الٰہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ دگرنہ ایک دم سے نادم ہو کر ہمارے دلوں سے اُتر جاتا ہے۔" [۲]

یہ صحیح ہے کہ علامہ اتفاقات کا سہارا بہت لیتے ہیں مثلاً اچانک کسی بیوہ کو گھر کے پرانے صندوق سے ایک ہزار روپے مل گئے یا کسی انگریز کی جان بچانے کا

---

۱ مصورِ غم بحیثیت مصلحِ نسواں
مشمولہ راشد الخیری تنقیدی مقالات ص ۱۲۵

۲ اردو افسانہ تحقیق و تنقید ص ۵۲

موقع مل گیا اور بہت سے مسائل ہو گئے۔ اور کبھی لیڈی ڈاکٹر حالات کا شکار ہو کر اپنے ٹیں ڈھونے لگ جاتی ہے۔ دولت مند ایک دم قلاش اور صحت مند عازم ملک عدم ہو جاتا ہے۔ ایسے اتفاقات بہت کمزور فنی سہارے ہوتے ہیں۔

ان کے افسانوں میں تکنیک کا تنوع تلاش کرنا مناسب نہیں، مگر وہ سادہ، بیانیہ رنگ میں کبھی خطوط کی آمیزش سے اپنے افسانوں کی تکنیک کو یک رنگی سے بچا لیتے ہیں۔ مگر ظاہری تکنیک یا فنی وسائل ان کی ترجیحات میں مقدم نہیں تھے۔ انھوں نے جس مقصد کے حصول کے وسیلہ افسانے کو بنایا۔ اس کے سائے میں انھوں نے تخلیقی عمر بسر کر دی۔

علامہ راشد الخیری کی کمزوری اور طاقت کا سرچشمہ ان کی زبان ہے۔ وہ بے شک دلّی والے تھے۔ ان کی زبان میں بے حد چاشنی اور فصاحت ہے۔ نسوانی مکالمے بھی وہ فطری انداز میں بڑی روانی کے ساتھ لکھتے تھے۔ مگر کہیں کہیں زبان و بیان کا چٹخارہ دلّی کا مخصوص نسوانی روزمرّہ اور محاورہ افسانوں کے مرکزی تاثر پر غالب آجاتا ہے اور زبان کے ایسے استعمال سے پیدا ہونے والی مقامیت ان افسانوں میں بہت کھلتی ہے۔ جن کے کردار اور ثقافتی فضا دہلوی نہیں ہوتی۔ اسی طرح ان کی شعریت بھری زبان رقت آفرینی اور جذبات انگیزی میں تو مدد کرتی ہے، مگر بسا اوقات یہ انشاء پردازی مضحک انداز بھی اختیار کر لیتی ہے۔

مگر نذیر احمد کی طرح راشد الخیری کہانی بُننے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ اپنے عہد کے بے حد مقبول کہانی نویس تھے۔ ان کے افسانے اپنی انتہائی نفاست کی وجہ سے بہت جلد زبان زد ہو جاتے تھے۔ اور ان کے بہت سے افسانے ایسے حصّے رکھتے ہیں جنھیں ان کے معاصر افسانہ نگار پریم چند کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ ان کے مندرجہ ذیل افسانے اُردو افسانے کی روایت کے اہم نقوش ہیں۔

افراط و تفریط، نانی عشو، مچھیرن کا جھولا، خدا فراموش، کھبوتر کی دُلہن، تین بہنیں، خدائی راج، بی انجمن، کلو نتیاں، سیاہ داغ، محرم وراثت، تقصیر عبادت، فرشتہ بیوی اور حج اکبر وغیرہ۔

مضمون نگاری:

راشد الخیری نے اپنا تخلیقی سفر اُس وقت شروع کیا جب ہندوستان میں جدید تعلیم اپنی ابتدائی حالت میں تھی اور اخبارات و رسائل کا مطالعہ کرنے والے گھرانے بڑے بڑے شہروں میں بھی بہت کم تھے اور جن خاندانوں کا تعلیم کا کچھ چرچا تھا ان میں بھی ایسے افراد کی کمی نہیں تھی جو اخبارات و رسائل کا لڑکیوں کی نظر سے گزرنا معیوب سمجھتے تھے۔ ان حالات میں لڑکیوں کی تعلیم اصلاحِ معاشرت اور حقوقِ نسواں پر مضامین لکھنا بہت ہمت کا کام تھا۔ اور یہ کام ان لوگوں نے جاری کیے جن کے دلوں میں تھوڑا یا بہت عورتوں کی ترقی یا اصلاح کا حقیقی درد موجود تھا۔

راشد الخیری تعلیم نسواں کے حامی تھے اور رسالہ مخزن میں وقتاً فوقتاً نسوانی زندگی کے فلسفے، بے بسی اور بے کسی پر مضامین لکھتے رہے۔

اندازِ بیان کی دردانگیزی، قلعۂ معلّیٰ کی بیگماتی زبان اور بے زبان عورتوں کی حقیقی جذبات کی ترجمانی نے عورتوں میں ہیجان پیدا کر دیا اور انھوں نے یہ تقاضا کیا اور خواہش ظاہر کی کہ مخزن پریس دہلی سے مخزن ہی کے معیار کا ایک زنانہ رسالہ جاری کیا جائے تاکہ عورتوں کے جذبات کو زیادہ مؤثر پیرائے میں اور ان کی ضروریات کو بہتر طریقے سے پورا کیا جا سکے۔ لہٰذا ۱۹۰۸ء میں "عصمت" رسالہ مستورات کے تقاضے کے تحت جاری کیا گیا جس نے پورے ہندوستانی پریس میں دھوم مچا دی۔

"عصمت" کے مقاصد میں ایک بڑا مقصد مستورات میں مضمون نگاری کا شوق پیدا کرنا بھی تھا۔ اُس زمانے میں لکھنے والیوں کی گنتی بہت کم تھی لہٰذا جہاں راشد الخیری اپنے مخصوص رنگ میں مؤثر مضامین تحریر فرماتے ہیں، وہاں نہایت ہی عام فہم زبان میں خانہ داری، بچوں کی پرورش، حفظانِ صحت کے چھوٹے چھوٹے مضامین عورتوں کے فرضی نام سے بھی لکھتے تھے۔ جن کو پڑھ کر خواتین کو ترغیب ملی اور خود لکھنے کا شوق ان کے دلوں میں پیدا ہوگیا اور بہت سی ہونہار لکھنے والیوں نے مستقبل میں بحیثیت مضمون نگار نام بھی پیدا کیا۔

راشد الخیری کا شمار دہلی کے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے اور ناول بھی اور ادبی صحافت میں بھی ممتاز مقام حاصل کیا۔ انھوں نے عورتوں کے مسائل پر سب سے زیادہ مضامین لکھے اور ان کی سماجی حیثیت کو بہتر بنانے اور ان کے حقوق کی پاسداری کا احساس پیدا کرنے کے لیے وہ مسلسل تحریر و تقریر کے ذریعے اپنی بات دوسروں کے دلوں تک پہنچاتے رہے۔ "عصمت" میں انھوں نے زنانہ مسائل پر کئی مضامین میں نہایت مفصّل اور مدلّل بحثیں کی ہیں۔ جن میں لڑکیوں کی تعلیم، ان کے شرعی حقوق، بچوں کی تربیت، فرائض کی ذمہ داری، معاشرتی اصلاح، مغربی تقلید، مشرقی خوبیاں غرض مختلف موضوعات پر اپنی رائے زنی کرتے ہیں۔ اور ان مضامین سے مردوں کو عورتوں کی پست حالت کا خیال ہونا شروع ہوا۔ اور بہت سے مردوں نے عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے مضامین لکھے اور ادب، تہذیب و تمدّن، علم و فن اور صنعتِ زبان کے خزانوں میں قابلِ قدر اضافے کیے۔

راشد الخیری حقیقت میں ان ادیبوں کے زمرے میں تھے جو کسی مقصدِ حیات کے ساتھ آتے ہیں اور جن کی تحریروں اور تقریروں کے زیرِ سطح ایک خاص پیغام ہوتا ہے۔ راشد الخیری بھی سوسائٹی کی اصلاح چاہتے تھے اور اس مقصد کے تحت ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے روشنائی کبھی خشک نہیں ہوئی۔ وہ مغرب کے خود ساختہ معیار سے مشرق کے ادبیات کو جانچنا حد درجہ بنیادی غلطی تصوّر کرتے تھے۔ ان کے نزدیک ہر ملک کی ضرورتیں اور ہر قوم کے خصائل جُدا گانہ ہوتے ہیں اور ہر ماحول اپنے ادب کے لیے نیا معیار بناتا ہے۔ قدیم و جدید معاشرت کا سوال ہمیشہ ان کے لیے باعثِ حُسن و رنج رہا اور اس کے لیے ان کے جو آنسو نکلے وہ خُشک ہو جانے والے نہیں تھے بلکہ ان میں سے سمندروں کی طوفان خیزی موجود ہے۔ حالانکہ ان کا معاشرتی تجربہ اپنے ہی طبقے یا پھر مسلمانوں کے متوسط گھرانوں کے گرد گھومتا ہے۔ وہ غم کی داستان سُناکر ہمدردی کے جذبات اُبھارنا چاہتے ہیں اور مذہب کا ذکر چھیڑ کر اُس کے تابناک اصولوں کو روشن اور شفاف صورت میں سامنے لاکر یہ توقع کرتے ہیں کہ ان کا

مخاطب طبقہ اس بات کو سمجھ جائے گا۔ ممکن ہے ۸۰ برس پہلے اصلاح کا یہی تصور لکھنے اور پڑھنے والوں کو زیادہ اپیل کرتا ہو۔ حقیقت میں ان کا مقصد اصلاحی مضامین لکھنا تھا۔ اصلاحی نقطۂ نظر سے وعظ کہا تھا۔ لیکن بقول پریم چند:

> "مولانا راشد الخیری کے مضامین میں صداقت ہے، درد ہے، غصہ ہے، بیچارگی ہے، جھنجلاہٹ ہے۔ وہ سماج کی بے اثری، بے حسی، بے دردی سے نالاں ہیں .... کاش ان کی آواز میں صورِ اسرافیل کی سی ہنگامہ خیزی ہوتی۔ اس انہماک میں بعض اوقات ان کی تصانیف میں فنی خامیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا خیال ہونے لگتا ہے کہ یہ کسی خطیب کی اپیل ہے کوئی ادبی تخلیق نہیں۔" [1]

مختصراً ازدواجی زندگی کے تاریک پہلوؤں پر راشد الخیری جیسے حساس مصنف کی نگاہ برابر رہی۔ اُنھوں نے اپنی تمام تصانیف میں طبقۂ نسواں کی جنگ لڑی ہے۔ وہ عورت کے ساتھ کسی بھی ظلم اور ناانصافی کو برداشت نہیں کرتے۔ اگرچہ اُن کی تخلیقات میں پند و نصائح کبھی کبھی فن پر غالب آگئے ہیں۔ لیکن اُن کی تحریروں میں فن اور زندگی کا توازن برقرار رہا اور ان کا دردمند دل ہمیشہ طبقۂ نسواں کے لیے بے چین رہا۔

راشد الخیری کی شاعری:

شاعری کا تعلق ابتدا ہی سے جذباتِ انسانی اور اس کے خیالات و احساسات اور اس کی ترسیل سے ہے۔ عربی، فارسی اور اردو میں شاعر کے اصل معنی ہی باشعور،

---

[1] مضامینِ پریم چند ص ۱۶۱، ۱۶۲
بحوالہ اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی ص ۱۲۴

باخبر اور ادراک کرنے والے کے ہیں۔ سنسکرت لفظ "کومی" کے معنی بھی دانشور اور عارف کے ہیں، اس لیے ادیبوں نے اُسے ذریعۂ اظہار بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سب اس میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ یہ ایک خداداد صلاحیت ہے۔ علامہ راشد الخیری نے بھی خاصی نظمیں لکھی ہیں۔ اگرچہ ان کی شاعری میں جذبۂ عشق و محبت کے ساتھ قوم کے درد کی ایک چبھن بھی ہے اور قوم کو تنبیہ کرنے کا جذبہ بھی موجود ہے۔ اُنھوں نے اردو نثر کو شاعری پر ترجیح دی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس دور میں شاعر کی حیثیت سے شہرت حاصل کرنا کارے دارد تھا اور وہ دوسرے شاعروں کی طرح زلف و شانہ، چشم ابرو، لب و رخسار، خدو خال کی مدح تو نہیں کرسکتے تھے اور دردِ قوم سے آشنا کوئی دل اسے برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے علامہ نے بھی اس طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ مگر ان میں شعرگوئی کی صلاحیت ضرور تھی اور یہ حقیقت ہے کہ اگر وہ شعر و سخن کی جانب توجہ کرتے تو آج اُن کا نام متاخرین شعراء کی فہرست میں ممتاز جگہ پر ضرور ہوتا۔ شعر و شاعری کی دنیا سے الگ رہنے کے باوجود راشد الخیری نے شاعری کی ہے۔ اوّل تو ان کی نثر ہی تمام تر اعلیٰ درجے کی شاعری ہے۔ لیکن اُنھوں نے باقاعدہ شاعری بھی کی ہے۔ ان کی نظموں میں بھی نثر کی طرح درد و تڑپ اور سوز و گداز ہے اور عروض و قواعد کی پابندی ہے۔ اُن میں وزن بھی ہے اور قافیہ بھی اور مروجہ بحروں کا احترام بھی ہے۔ اس کے باوجود ان کی شاعری پر یہ اعتراض ہے کہ فن کے لحاظ سے اس میں بہت سی خوبیاں نہیں ہیں اور یہ بات بعد میں اُنھوں نے خود بھی کہی ہے:

> "میں شعر کہنے کا مدعی نہیں ہوں۔ میرے خیالات اتفاق سے اس نظم کی شکل میں ڈھل گئے ہیں۔ کوئی صاحب مہربانی فرما کر اسے شاعری کی کسوٹی پر نہ پرکھیں!"[1]

---

[1] "صدائے راشد" مشمولہ "عصمت" اگست ۱۹۱۸ء ص ۲۲

ان کی نظموں کے دو مجموعے رودادِ قفس اور گرفتارِ قفس چھپے ہیں جس میں انسانی جذبات اور وارداتِ قلب کی تصویریں ایسے درد بھرے الفاظ میں کھینچی گئی ہیں، بے اختیار آنسو نکل پڑتے ہیں۔ وہ فرقۂ نسواں کو بجا طور پر اسیرانِ قفس سمجھا کرتے تھے جنھیں انسان محض اپنی تفریحِ طبع کی خاطر کھلی ہوا اور آزادانہ پرواز سے محروم کر کے ایک پنجرے میں قید کر دیتا ہے اور اسی رعایت سے ان کی مجموعوں کے نام پسند کیے گئے ہیں۔

ان میں شعر گوئی کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ جذبات نگاری اور منظر کشی میں انھیں خداداد ملکہ تھا اور مملکتِ تخیل کے وہ فرماں روا تھے۔ عبرت و نصیحت مقصد کی تڑپ اور درد کی تاثیر سے نثر کی طرح ان کی کوئی نظم خالی نہیں۔ رودادِ قفس ان کی درد انگیز نظموں کا پہلا مجموعہ ہے اور اس کی اکثر نظمیں بڑی دردناک ہیں جو ان کے واقعی شاعر ہونے کا ثبوت ہیں۔ منظر کشی کے چند نمونے ملاحظہ کیجیے۔

برسات کی یہ رات اور پچھلا پہر سر پر گھٹا
ہے کس قیامت کا اندھیرا ہر طرف چھایا ہوا

ٹھنڈی ہوا برسات کی اور سائیں سائیں رات کی
قانونِ قدرت کا ہے ہر ہستی پہ جادو چل رہا

اس عالمِ سنسان میں جھونکے ہوا کے کان میں
انگنائی میں دالان میں لاتے ہیں یہ کیسی صدا

(صدائے راشد ۱۹۱۸ء)

دیارِ یثرب میں شامِ غربت سر حسینہ پہ آ رہی ہے
زمیں پہ ہلکا سا تھا ترشح فلک پہ بدلی سی چھا رہی تھی

ہوا کے جھونکے سے کپکپاتی قدم بڑھائے چلی بدری
کہ پہنچوں منزل پہ جلد جا کر کروں سواری کے اپنے درشن

(مظلوم حسینہ ۱۹۱۹ء)

ہوا جنگل کی ٹھنڈی تھی اندھیرا خوب تھا چھایا
اُجالا تھا نہ تارے تھے کہ بادل گھر کے آیا تھا
کڑک تھی اس قیامت کی کہ پار ہوتی تھی کانوں میں
چمک نے اک آفت کر رکھی تھی ہر طرف برپا

مجھے اس راحت و فرحت میں یادِ رفتگاں آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے سیدھا گھر کے قبرستان جا پہنچا
کڑک کا شور دیا ہی چمک کا شور کچھ بڑھ کر
نہ آدم تھا نہ آدم زاد گھر کا تھا نہ کھٹکا تھا

نظر بجلی میں آجاتے تھے ہر جا ڈھیر قبروں پر
نہ ہو ہو کچھ تھی اُلو کی نہ چمگادڑ کا سناٹا
یہ سونے والے متوالے کچھ ایسی نیند سوئے تھے
نہ بجلی کی خبر مطلق نہ تھا کچھ خوف بادل کا

میں اپنی کونپلوں پہ رو رہا تھا حزن کے آنسو
کہیں تھی بے خبر دلہن کہیں تھا سو رہا بچہ

(میری عید سلوارہ ۱۹۲۸ء)

راشد الخیری نے جذبات کے تمام رنج والم مسرت و انبساط اور حیرت و غصے کی کیفیات کی بھی ایسی مصوری اور ترجمانی کی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

اندھیرے اُجالے ہوئے جائیں گے
یہ دنیا کے جھگڑے چلے جائیں گے

محبت کی منزل پہ ہر ہر قدم
مکمل مصیبت ہو یا بیش و کم

حقیقت تو یہ ہے کہ راحت ہے یہ
جو آفت بھی آئے تو نعمت ہے یہ

اگر بال بھی اس کا بیکا ہوا
تو پھر زندگی کا رہا کیا مزا

تجھے قتل یوں جس کا مرغوب ہے
ارے سنگ دل میرا محبوب ہے

میں بسمل ہوں ظالم دعا میری لے
بچا ہوگی کے مجھے داغ سے

(سرخاب کا دم واپسیں)

کہا بیٹی یہ جنگل یہ اندھیرا اور تنہائی
کڑک اور چمک میں کیوں کر آئیں کون لا یا

لگی کہنے میری اماں کو جب یاں مرد لائے تھے
چلی آئی تھی میں بھی ساتھ مجھ کو یاد ہے رستہ

کہا تھا مجھ سے یہ سب نے کہ تھوڑے دن میں آئیں گے
مگر دن ہو گئے اتنے کہ خود آئیں نہ خط آیا

کھڑی ہوں دیر سے اتنے کھلاتی ہیں نہ کھاتی ہیں
خفا مجھ سے ہوئیں شاید اسی کا سبب ہے یہ حصہ

یہ حصہ میری اماں جان کو اب تم ہی پہنچا دو
یہ کہہ دینا سلیمہ نے ہے کھانا آپ کا بھیجا

یہ کہنا منتیں کی ہیں بہت ہی ہاتھ جوڑے ہیں
وہ جب لے لیں تو اس کے بعد اتنا اور کہہ دینا

ارے بی عید ہو گی کل رہوں گی کب تلک سوتی
بجا ہے شام ہی کو مسجدوں میں چاند کا دھونسا

حبیبہ اور صفیہ کی نئی ہیں جوتیاں آئیں
چھپا چھپ ٹنک رہا ہے بی ننھی جان کا کرتا

یہ میرے ہاتھ سونا ہے نہ مہندی ہے نہ چوڑی ہے
یہ میرا جسم ننگا ہے نہ پاجامہ ہے نا کرتا

نہ جوتی پاؤں میں میرے نہ سر پر اوڑھنی میرے
یہ دیکھو خون بہتا ہے چبھا ہے پاؤں میں کانٹا

(میری عید منوا دو ۱۹۲۸ء)

"بچپن کی یاد" علامہ کی ایک بہت ہی عمدہ نظم ہے۔ اس میں ایک سہیلی
دوسری سہیلی کے خط کا جواب دیتی ہے کہ اسے بچپن کی پرانی محبت ستاتی ہے اور

بچپن کے کھیلوں اور معصومانہ حرکات کا خیال اس کے دل کو بے چین کرتا ہے اور پھر بالآخر موجودہ گرفتاری کا احساس جذبات کے اس تلاطم کو دبا دیتا ہے۔

بچپن کی کھیلی صادقہ میری سہیلی صادقہ
پیاری سہیلی صادقہ خط کا تمہارے شکریہ

میں دور تھی مجبور تھی رنجوں میں چکنا چور تھی
ورنہ بجز تیس لاکھ تم میں آپ ہی ہستی منا

تاروں بھری راتیں گئیں طاقوں بھری گڑیاں چھٹیں
دن کھیل کے رخصت ہوئے اب وقت ہے کچھ کام کا

پیپل کی چھاؤں یاد ہے دن تیرہ ہوتا تھا جہاں
مدت ہوئی دیکھا نہیں واں گھونسلہ تھا چیل کا

اس مصرع میں کس قدر گہرا مطالعہ فطرت ہے۔ بلبل کے آشیانے کا ذکر تو ہر دیوان کے صفحہ پہ ایک سے زیادہ اشعار میں مل جاتا ہے۔ لیکن چیل کے گھونسلے پر اسی شاعر کی نگاہ جاسکتی تھی جو قدرت سے باریک بین نگاہ لے کر آیا تھا۔ راشد الخیری ایک فطری شاعر تھے وہ ایک شاعر کا دل لے کر پیدا ہوئے تھے اور یہ بات بالکل یقینی ہے کہ اگر وہ اپنی اس استعداد کو کام میں لاتے تو یقیناً ایک کامیاب شاعر ہوتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعر بن کر وہ اس سے زیادہ کام نہیں کر سکتے تھے جو ایک نقاد کی حیثیت سے انھوں نے کیا۔ حقیقتاً شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی ان کی شاعری پر عشقیہ غزلیں، مزاحیہ قصیدے قربان کیے جاسکتے ہیں۔ ایک بلبل کی فریاد کچھ ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

کچھ عرض کرنے ماؤں سے آئی ہیں یہ دکھیاریاں
صورت سے ظاہر ہے کسی چہرے سے حسرت ہے عیاں

جو مل گیا وہ لے لیا جو دے دیا وہ کھا لیا
جب نیند آئی پڑ رہے ہم نے جگہ پائی جہاں

شرم و حیا عادت رہی شرم و حیا شیوہ رہا
کے چُپکے ہو گئے بے وجہ کھائیں گھڑکیاں

ان جملوں میں کس قدر معنی پنہاں ہیں :
بیٹے مبارک ہوں تمہیں مہمان کو رخصت کرو
لو وقت آخر ہو چکا اب ہم کہاں اور تم کہاں

'ماں کا پیام' علامہ کی ایک پُر درد نظم ہے۔ جس میں ایک ایسی ماں کے دل کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے جس کا اس سے جُدا ہو گیا ہے اور وہ اس کی تلاش میں سرگرداں ہے :

اس دل کی لگن نے کیا جوگن گھر بار چھٹا تیرے کارن
نینا ترسیں دکھلا درشن چھتیاں لگ جا آجا احسن
چلتی ہے ہوا پھولوں میں بسی کہسار میں جب دن ہوتا ہے
آتی نہیں بو تیری تکیں دل خون کے آنسو روتا ہے

راشد الخیری فطری طور پر مذہب پسند اور اصلاح پسند تھے۔ اپنی نظموں میں بھی وہ اپنے ناولوں کی طرح نہایت عمدگی اور کمال کے ساتھ مسلمان عورتوں کے دُکھوں اور تکلیفوں کو بیان کرتے ہیں۔ ان کی ہر نظم ایک خاص کیفیت یا نصیحت کو وضاحت کے ساتھ پیش کرتی ہے یا کسی خیال یا جذبے کی تفسیر پیش کرتی ہے اور اس کو تشبیہات و دلائل کے ساتھ واضح کرتی ہے۔ وہ بنیادی طور پر نظم گو تھے کیوں کہ ان کی نظمیں احساسات سے زیادہ فکر و خیال کی تکمیل کرتی ہیں اور ان کے موضوعات میں

کائنات کا ہر رُخ اپنے تجزیے اور تحلیل کے تسلسل کے ساتھ آتا ہے۔ ان کی نظمیں "یتیم بچیوں کا خطاب دولت مند خواتین سے" "سرخاب کا دم واپسیں" "التجائے قیصر" "اسلم کا خط شوہر کے نام" "خالد بن ولید وغیرہ۔ نہایت پُر تاثیر اور رزدانگیز اور فنی نقطۂ نظر سے بلند پایہ نظمیں ہیں۔ حمد باری میں تحریر فرماتے ہیں:

باقی ہے بس وہی رب　　فانی ہے ماسوا سب
کافی ہے وہ اکیلا　　باقی ہے سب جھمیلا
حاکم ہے بحر و بر کا　　ہر شے پہ نور اس کا
ہر چیز میں نہاں ہے　　ہر چیز سے عیاں ہے

قافیہ اور حُسنِ قافیہ کا لحاظ ہر جگہ ملحوظ ہے۔

خورشید میں نہ آئے　　ہر ذرّے میں سمائے

اس نظم کے آخری شعر میں ایک محاورہ بھی باندھا ہے، لیکن سلاست اور زبانِ کمال کے ساتھ۔

مذکورہ جلوۂ ذات
چھوٹا سا مُنہ بڑی بات

خالد بن ولید وہ نظم ہے جس میں راشد الخیری نے اسلاف کے کارناموں اور ولولوں کا ذکر مؤثر اور زور دار الفاظ میں کیا ہے کہ کس طرح شجاعت کے لحاظ سے وہ قیصر و کسریٰ پر حکومت کرتے تھے، لیکن جوشِ ایمانی، خوفِ خدا اور رحم دلی کے اعتبار سے اس قدر نرم مزاج تھے کہ اندھے کے سامنے بھی اپنے عجز کا اعتراف کرتے تھے۔ یہاں اس واقعے کا بھی ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ کا پاؤں اندھیرے کی وجہ سے ایک اندھے فقیر کے پاؤں پر جا پڑا تو آپ نے اس سے معافی مانگی تھی:

آلا اے قوم بدقسمت یہ حالت اور یہ صورت
ہوئے اعلیٰ سے تم ادنیٰ بنے شاہوں سے زندانی

خدا کی شان اب وہ دوسروں کو درسِ عبرت ہوں
کیا کرتے تھے جو کل تک شہنشاہی جہاں بانی

رگڑ دی قیصر و کسریٰ کی گردن یہ شجاعت تھی
گرے قدموں پہ اک اندھے کے یہ تھا جوشِ ایمانی

مگر میدان میں جس وقت تیغِ خالدی چمکی
تو عالم دنگ تھا حیرت میں تھے رومی و نصرانی

نہ تھی تلوار بجلی تھی قیامت تھی کہ آفت تھی
کہ دم گھنٹے میں پِتّہ دشمنوں کا ہو گیا پانی

راشد الخیری نے ہر نظم کے واقعات کو اس قدر غم انگیز پیرائے اور درد و اثر میں ڈوبا ہوا بیان کیا ہے کہ اس میں زندگی کی معنویت کا اظہار ہوتا ہے۔ "سرخاب کے دم واپسیں" میں جب نر کو گئے ہوئے بہت دیر ہو گئی تو مادہ بڑی بے قرار ہونے لگی۔ ان اشعار میں مضمون کی بلندی، بیان کی سلاست اور جذبات نگاری کی سچی تصویر کشی کا اظہار ایسے موثر پیرائے میں کیا ہے جو کسی اچھے شاعر ہی کے قلم سے ادا ہو سکتے تھے۔ سرخاب کا دم واپسیں ایک مثنوی ہے جس میں ایک المناک واقعہ دکھایا گیا ہے۔ اس نظم کے شروع میں سرخاب اپنی مادہ کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے:

رسیلی یہ آنکھیں چمک دار سر
یہ نازک کمر اور یہ رنگین پر

زمرد و پکھراج و نیلم ہے تو
نشیمن کی ملکہ ہے بیگم ہے تو

سرخاب اپنی مادہ اور بچوں سے جُدا ہوکر خوراک کی تلاش میں نکلتا ہے۔ واپسی میں دیر ہونے پر مادہ کا اضطراب دیکھیے:

لگی کہنے مولا مجھے کیا ہوا
یہ سینے میں دل کیوں دھڑکنے لگا

مَرا یا کہ زندہ پھنسا جال میں
یقیناً یہ کالا ہے کچھ دال میں

یہ دھونتال پانی کڑک کا یہ زور
یہ بجلی یہ بادل ہوا کا یہ زور

یہ پڑنے کو اولے بھی تھے آج کیا
سوامی نگہبان تیرا خدا

راشد الخیری ایک اچھے طنز نگار بھی تھے اور اپنی نظموں میں بھی اُنھوں نے اس سے خاطر خواہ کام لیا ہے اور اکبر الہ آبادی کی طرح مغربی تہذیب کی پھبتیاں اُڑائی ہیں۔ فرماتے ہیں:

پھینکو پرانے لیتڑے	چھوڑو لبیری جھیتڑے
گاؤن بھی ہو اور بوٹ بھی	وقت کا ہے یہ اقتضاء
چُوٹھے میں اب برقعے رکھو	پردے کو رولو کا لگا

مہر و وفا کی جائیاں شرم و حیا کھونے لگیں
اور بیبیاں ستونتیاں کلونتیاں ہونے لگیں

راشد الخیری نے نثر کی طرح اپنی نظموں میں محاورہ اور روزمرّہ کا استعمال خوبصورتی

سے کیا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت محاورے مصرعوں میں اس طرح آتے ہیں کہ شعر میں حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے اشعار میں نرم و ملائم الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے ترنم، موسیقیت اور تمنائیت پیدا ہوتی ہے۔ ان کی بحریں بھی نہایت مترنم ہیں۔

یہ کیوں خوشحال ہیں چہرے — یہ کیوں بشاش ہے دنیا
میں جانوں ہے وہی آئی — انھیں کی سب یہ خوشیاں ہیں
مری اماں کل آئیں گی — ہو ہو ہو، ہا ہا ہا

(میری عید منوادو ۱۹۲۸ء)

بے شک راشد الخیری کی شاعری میں وہ وقتی خوبیاں جو شاعری کا سرمایہ سمجھی جاتی ہیں مثلاً نپے تُلے الفاظ، تشبیہیں، ہزاروں شاعروں کے استعمال کیے ہوئے استعارات اور لاکھوں زبانوں سے بار بار بیان کی ہوئی عشق و محبت کی داستانیں، قافیہ پیمائی، رعایتِ لفظی، کاوشِ سنگلاخ زمینوں کا اختیار کرنا۔ ان کے کلام میں نہیں پائی جاتیں اور نہ ہی ان کا مقصد اپنی قادرالکلامی دکھلانا اور صرف زبان و بیان کی خوبیوں کو پیدا کرنا تھا۔ مگر ان کی شاعری میں نپے تُلے الفاظ کے بجائے دردمند دل کے ٹکڑے اور داستانِ محبت کے بجائے قوم کی بربادی اور تباہی کا دُکھ بھرا افسانہ ضرور موجود ہے۔ شاعر کا محض موضوع موزوں طبع ماہرِ فن اُستاد ہونا ہی کافی نہیں اس کے کلام میں داخلی ترنم ضروری ہے اور یہ داخلی ترنم کسی شاعر کے کلام میں اُس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس کے قلب میں گہرے یا پُر جوش تاثرات و احساسات نہ ہوں اور اس کا دل حساس اور زخم خوردہ نہ ہو اور یہ احساسات و تاثرات راشد الخیری کی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہیں جو ہمیں یہ احساس دلاتے ہیں کہ اگر علامہ نے اپنا وقت اور اپنی کوشش شاعری کی تہذیب پر صرف کی ہوتی تو یقیناً وہ بیسویں صدی کی شاعری میں ممتاز جگہ پر ہوتے۔

باب چہارم

راشد الخیری کی زبان و بیان اور اسلوبِ تحریر

اُردو میں بہت کم مصنفین ایسے ہیں کہ جن کا اندازِ بیان اور اسلوبِ نگارش ایک انفرادی شان رکھتا ہے۔ راشد الخیری کی زبان و بیان ان کی تحریروں کا سب سے کامیاب پہلو ہے اور ان کی شخصیت کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ وہی سادگی و صفائی، بے ساختگی اور شگفتگی جو ان کی شخصیت کے نمایاں اوصاف تھے، ان کے طرزِ تحریر میں بھی صاف نظر آتے ہیں۔ پھر ان کی عوام دوستی، اصلاحِ نسواں کا جذبہ، انسانیت، معاشرے کی اصلاح کا جذبہ جس نے ان کی زندگی کو تابناکی بخشی۔ ان کے طرزِ تحریر میں بھی اپنے غیر فانی نقوش چھوڑے ہیں۔ حالانکہ ان کی شروع کی تحریروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مولانا نذیر احمد سے بہت متاثر ہیں۔ اور بلاشبہ حیاتِ صالحہ اور منازل السائرہ میں نذیر احمد کے اسلوب کی جھلک نظر آتی ہے، لیکن یہ علامہ کی ابتدائی کوششیں تھیں۔ اس کے بعد انھوں نے کم و بیش ستر کتابیں لکھیں اور اپنا اسلوب تحریر اختیار کیا۔ ان کا اسلوبِ تحریر اختیار کیا ہوا نہیں ان کا فطری ہے۔ وہ دہلی کی زبان پر پوری طرح عبور رکھتے تھے۔ وہ جس طرح سوچتے تھے۔ اسی طرح لکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں ان کے غور و فکر کا عکس ہے۔ انشاء پردازی کا کمال یہ ہے کہ انشا پرداز پڑھنے اور سننے والے پر جس قسم کا اثر پیدا کرنا چاہے بے تکلف پیدا کر دے۔ اس اعتبار سے راشد الخیری اپنی مثال نہیں رکھتے۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد:

> "راشد الخیری اُردو میں ایک ادائے خاص لائے تھے جو ان کے ساتھ ہی موت کی گود میں سو گئی۔"[۱]

---

۱ روزنامہ "چٹان" لاہور ۱۹۵۵ء بحوالہ عصمت اگست ۱۹۶۴ء ص ۳ ۸ ۵

راشدالخیری اردو میں ایک ادائے خاص لائے تھے کہ ان کی تحریر کی یہ دلکشی، جاذبیت اور روانی کی ان کے مضامین کو پڑھ کر کہیں ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ اُنھوں نے قلم روکا اور کسی خاص نقطہ کی تلاش کی ہے۔ ان کے مختصر افسانے "چراغِ سحری" سے یہ مثال ملاحظہ ہو:

"یہ چراغ ٹمٹما گئے اور عمر کی بتی جھلملا چکی تو تمہارا ان کا سامنا ہے تو بس اتنی دیر کا کہ نسیم کا جھونکا اُنھیں ٹھنڈا کر دے پھر یہ کہاں اور تم کہاں۔ مامتا ان کے ساتھ ختم ہو گئی اور دعا کے دروازے ان کے ساتھ بند۔ تمہارے داغ کلیجے پہ لے جائیں گے۔ پھر تمہارے کان ان کی آوازیں نہ سنیں گے"۔[۱]

راشدالخیری کا اسلوب اردو ادب میں جداگانہ اہمیت کا حامل ہے۔ اُردو کے نقّادوں نے ان کی سحر نگاری کا اعتراف اور طرزِ تحریر کی تعریف کی ہے۔ ان کے قریبی ہم عصر پریم چند فرماتے ہیں:

"ادیب کے لیے حساس دل اور حُسنِ بیان میں سے ایک بھی کم ہو جائے تو ادیب کا رتبہ کم ہو جاتا ہے۔ کتنا ہی حُسنِ بیان ہو اگر ادیب کے دل میں درد نہیں تو اس کے کلام میں تاثیر ممکن نہیں۔ شاید حُسنِ بیان بھی دردہی کی ایک صورت ہے۔ حالانکہ ایسے باکمال بھی دیکھے گئے ہیں جن کے طرزِ بیان میں ساری خوبیاں موجود ہیں۔ مگر درد نہیں۔ ایسے ادیبوں کی بندشوں کی اور ترکیبوں کی داد تو دی جا سکتی ہے مگر پڑھنے والا ان سے متاثر نہیں ہوتا۔ راشدالخیری میں یہ اوصاف موجود تھے اور یہی ان کی ادبی کامیابی کا راز ہے۔ اُنھوں نے نہایت دردمند دل

۱؎ چراغِ سحری (عصمت ۱۹۱۰) ص ۲۱

پایا تھا۔ وہ متوسط طبقے میں پیدا ہوئے اور اس طبقے کی معاشرت کے ہر پہلو سے وہ واقف تھے۔ اور اس کی خوبیاں اور برائیاں دونوں ہی اس کے پیشِ نظر تھیں۔" [1]

ڈاکٹر سید عابد حسین لکھتے ہیں:

"راشد الخیری کی کتابوں کی ایک نمایاں صفت ان کی پاکیزہ زبان ہے۔ بیسویں صدی کے انگریزی داں مصنفین کا عجز و بیان بڑی حد تک زبان سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ ان کی زبان پر انگریزی ترکیبیں اور محاورے چڑھے ہوتے ہیں اور وہ انھیں اردو کے الفاظ میں ادا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر چونکہ وہ اپنی زبان کی ساخت سے ناواقف اور اس کی روح سے نا آشنا ہیں اور ان کے الفاظ کا ذخیرہ بہت محدود ہے، اس لیے اپنے خیالات کو ادا کرنے کے لیے انوکھی ترکیبیں تراشتے ہیں جو اردو میں کسی طرح نہیں کھپ سکتیں۔ راشد الخیری بھی انگریزی داں تھے مگر ان کے ذہن نے دلّی کی اردو کی آغوش میں پرورش پائی تھی اور اپنی خداداد قابلیت کی بدولت اس تربیت سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس دور کے ناول نویسوں میں راشد الخیری کے سوا کوئی اردو پر پوری قدرت نہیں رکھتا اور اسے اہلِ زبان کی طرح نہیں برت سکتا۔" [2]

اور واقعہ یہ ہے کہ زبان و بیان کے استعمال میں ہر صنفِ ادب احتیاط، سلیقے اور مہارت کی متقاضی ہوتی ہے اور خصوصاً فنی لحاظ سے ناول کی تعمیر میں بہ یک وقت

---

[1] منشی پریم چند: عصمت (راشد الخیری نمبر) ۱۹۳۶ء ص ۱۲۲

[2] "ساقی" ستمبر ۱۹۳۶ء بحوالہ اگست ۱۹۶۴ء ص ۵۸۴

شاعری، ڈراما، انشائیہ اور رزمیہ سب کے اوصاف کارفرما رہتے ہیں اور چونکہ زبان کے لحاظ سے ہر صنفِ ادب کے اپنے کچھ تقاضے ہیں۔ اس لیے ناول نگار کو بڑی نازک ذمہ داریوں کا سامنا ہوتا ہے۔ صرف یہی نہیں "ناول کے مختلف حصوں میں ان کی مخصوص فضا کے اعتبار سے مختلف النوع زبان کے استعمال کے ساتھ ساتھ ایسے بحیثیت مجموعی اپنی زبان میں ایک ہم آہنگی اور ہمواری بھی پیدا کرنا ہوتی ہے جس سے اس کے طرزِ تحریر کی انفرادی خصوصیات کا تعین ہوتا ہے۔ راشد الخیری کی زبان و بیان ان کے ناولوں کا سب سے دل کش پہلو ہے۔

راشد الخیری بحیثیت ناول نگار:

ناول اپنی موجودہ فنی اور صنفی ہیئت میں صنعتی دور کی تخلیق ہے۔ اردو میں ناول کا آغاز اُس وقت ہوا جب ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں علوم و فنون، تہذیب و معاشرت کے اعتبار سے ایک نیا زمانہ طلوع ہو رہا تھا۔ ہندوستانی معاشرے کی یہ تبدیلیاں زندگی کے مادی حالات کی تبدیلی کا فطری نتیجہ نہیں تھیں بلکہ برطانوی سامراج کے اقتدار اور اس کی جیرہ دستی کا نتیجہ تھیں۔ اس لیے ان مصنوعی اور لادی ہوئی تبدیلیوں کو ہندوستانی ذہن آسانی سے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ہندوستان میں صنعتی اور سرمایہ دارانہ نظام اور جاگیردارانہ نظام برطانوی سامراج کے زیرِ سایہ پرورش پاتے رہے۔ اس طرح عام انسان یا فرد کی ذات اور سوسائٹی سے اس کی کش مکش جو ناول کا موضوع ہوتی ہے فی الاصل اسی زمانے میں اُبھر کر سامنے آئی۔ اس پس منظر میں اگر ہم اردو ناول کے ارتقاء کا جائزہ لیں گے تو دیکھیں گے تو نذیر احمد، سرشار اور شرر کی ناول نگاری میں جو روایتی طرزِ داستان در آئی ہے تو وہ بڑی حد تک اس بات کا نتیجہ ہے کہ ان کا زمانہ ناول کے لیے پوری طرح سازگار نہیں تھا۔ اس زمانے میں فرد اور اس کے کارنامے لوگوں کی دلچسپی اور توجہ کا محور نہیں ہوتے تھے۔ اس لیے ان کے ناول بدلتی ہوئی دلچسپی تہذیب اور زندگی کا فطری مطالبہ نہیں تھے بلکہ جس طرح اس عہد کی زندگی میں مصلحتوں اور مجبوریوں کے زیرِ اثر

یوروپ کی بہت سی تہذیبی علمی اور ادبی روایتوں کو اپنایا گیا۔ ناول بھی ان میں سے ایک تھا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی حقیقت نگاری میں مبالغہ اور رومان کی آمیزش ہے اور ان کے کردار کی ارضیت کے باوجود ایک تخلیقی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

نذیر احمد کے کردار جس زندگی کی نمائندگی کرتے ہیں وہ اس عہد کی واقفیت کو پوری طرح گرفت میں نہیں لاتی۔ ان کے ناولوں کا مقصد مسلمانوں کی معاشرتی، اخلاقی مذہبی اور اصلاحی تھا، اس لیے ان کا دائرۂ عمل اور حلقۂ فکر مسلمانوں کی گھریلو اور جماعتی زندگی تک محدود ہے۔ اس لیے باوجود ابن الوقت، کلیم، مبتلا، سید ناظر اور ظاہر دار بیگ کے کرداروں میں ہمیں ان انسانوں کی جھلکیاں مل جاتی ہیں جو بدلتے ہوئے حالات میں ایک نئی ذہنیت اور نئے معاشرتی اور معاشی اور نفسیاتی مسائل کو لے کر سامنے آرہا تھا۔

سرشار کے ناولوں کا میدان نذیر احمد کے ناولوں سے وسیع ہے۔ اگرچہ وہ مخصوص خطے یعنی لکھنؤ کی زندگی سے باہر نہیں نکلتے، لیکن ان کی فن کارانہ نظر اس زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے اور ان کے ناولوں میں ایک مٹتا ہوا نظام واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ان کے کرداروں میں کچھ اوصاف ایسے ہیں جو اس عہد کی زندگی میں پیدا ہونے والے تضاد اور تصادم کی نشان دہی کرتے ہیں۔ آزاد کی آزاد خیالی اور فرسودہ رسوم سے بیزاری، حسن آرا کی روشن خیالی، حب الوطنی اور اجتماعی بہتری کی خواہش سے وہ ماحول اور میلان بے نقاب ہو جاتا ہے جو ملک میں نئی تبدیلیاں لا رہا تھا۔ سرشار کا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے نہ صرف سحر و طلسمات بلکہ مذہب اور اخلاق کی قیود سے نکل کر عصری زندگی کے مظاہر کو اپنے فن کا موضوع بنایا اور اس عہد کے عام انسانوں کو اپنے قصوں میں کردار بنا کر پیش کیا۔ انھوں نے ایک کھلی فضا میں اور ایک لازوال پذیر معاشرہ کے پس منظر میں اپنے کرداروں کی ذہنیت، طرزِ عمل اور جذبات کو بے نقاب کیا۔ یہی خصوصیت سرشار کے ناولوں کو نذیر احمد کے ناولوں سے ممتاز بناتی ہے ورنہ فنی نقطۂ نظر سے دونوں کی تصانیف میں بنیادی خامیاں موجود ہیں، لیکن شرر کا فنی شعور نذیر احمد اور سرشار دونوں سے زیادہ بیدار تھا۔ پلاٹ کی تعمیر اور قصے کی مربوط اور متحد ترتیب کے اعتبار سے

ان کے تاریخی ناول مثلاً فلورا فلورنڈا اور فردوسِ بریں میں پہلی بار ایک صحیح فنی معیار سامنے آتا ہے، لیکن اپنے معاشرتی ناولوں میں شرر نے ڈرامائی واقعات اور رومانی عناصر پر اتنا زور دیا ہے کہ ماحول کے نقوش اور کرداروں کے خدوخال واضح نہ ہو سکے۔ آغا صادق کی شادی اور بدر النساء کی مصیبت کے قصے اسی حادثے کی بنیاد پر بنائے گئے ہیں کہ عقد کے بعد دلہنیں بدل جاتی ہیں۔ ان ناولوں کی دنیا مسلمانوں کی معاشرتی اور گھریلو زندگی تک محدود ہے۔

اگرچہ راشد الخیری خود اسی دور کے پروردہ تھے جو دور فی الاصل اصلاح اور تبلیغ و منادی کا دور تھا اور اتفاق سے وہ اس عبوری دور کی اصلاحی تحریکوں سے شدید طور پر متاثر اور مغلوب بھی تھے۔ جس کے نتیجے میں ان کے ناولوں میں ان کی فنی صلاحیتیں دب کر رہ گئیں اور ان کی فکر ایک محدود دائرے میں چند معروف مسائل اور مذہب و معاشرت کے خاص پہلوؤں تک محدود رہی۔ مگر راشد الخیری میں زندگی کو اس کی تمام جزئیات کے زندہ کرنے کی بے پناہ صلاحیت تھی اور انھوں نے اپنی بصیرت اور علم و فضل کی روشنی میں ایک خاص زاویہ سے اس کی تفسیر و تنقید بھی کی ہے۔ ان کے ناولوں کی بنیاد سائنسی اصولوں اور نفسیاتی حقائق پر مبنی ہے۔ ان کے تمام ناول زندگی سے بہت قریب تر ہیں اور وقت کی اہم ضرورت پر لکھے گئے ہیں اور اصلاحِ معاشرت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کے قلم میں تحریکِ نسواں کا عنصر خاص طور سے نمایاں ہے۔ پلاٹ کا سلجھاؤ اور ارکان کی ہم آہنگی ان کے ناولوں میں نمایاں ہے۔ وہ قاری کے جذبات و احساسات پر مکمل تسلط جما لیتے ہیں۔ جہاں تک کردار نگاری کا تعلق ہے تو ان کا کوئی بھی کردار بہت گہرا یا ذلیل نہیں ہے، لیکن ان کے کرداروں میں وہ جرأت اور ہمت نہیں ہے کہ وہ سماجی برائیوں کے خلاف بہادری سے سر اٹھا سکیں۔ اسی لیے ان کے بیشتر ناول اور افسانے المیہ بن کر رہ گئے۔

مؤودہ میں محسن کے باپ موودہ اور نوحہ زندگی میں صوفیہ کے باپ سات روحوں کے اعمال نامے میں احمد کے کردار مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ راشد الخیری کا عہد کا معاشرہ ایسا تھا کہ ان کے نسوانی کرداروں کی بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑیں۔ ان کرداروں نے سماج کی قربان گاہ پر اپنی زندگیاں تک بھینٹ چڑھا دیں۔ سنجوگ میں قدسیہ سات

روحوں کے اعمال ناموں میں قیصر اور گوہر مقصود میں صالحہ اس عہد کی معاشرت کے نقاش ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کے کردار ہمیں زندہ اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور ان کے ارتقا کا ڈھنگ اتنا فطری اور ماحول سے اتنا ہم آہنگ ہے کہ فوری تغیرات بھی ہمیں اُلجھن میں نہیں ڈالتے۔ حیاتِ صالحہ میں صالحہ کے کردار میں جو تغیر ہوتا ہے وہ اتنی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے کہ ہمیں ذرا بھی حیرت نہیں ہوتی۔ ان کے تمام کردار معاشرے کے چلتے پھرتے کردار نظر آتے ہیں۔ وہ محبت بھی کرتے ہیں۔ نفرت بھی کرتے ہیں۔ سلیقہ مند بھی ہیں اور پھوہڑ بھی۔ دوسروں سے متاثر بھی ہیں اور دوسروں پر اثر انداز بھی۔ وہ عادات و اطوار کے لحاظ سے ارتقا کی منازل طے کرتے ہیں اور مناسب انجام پر خوبصورتی سے پہنچ جاتے ہیں۔

اگرچہ راشد الخیری نے شروع میں نذیر احمد کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا شروع کیا۔ اور اپنے درد مند دل اور گداز طبیعت کی وجہ سے ہندوستان کی مسلمان عورتوں کے مصائب اور مظالم کو ایک مصلح کی نظر سے دیکھا اور ایک فلسفی کے ذہن سے سوچا اور انشا پرداز کے قلم سے ادا کیا۔ مگر وہ عورتوں کی اصلاح اور حمایت میں نذیر احمد سے آگے نکل گئے۔ اور اپنی زندگی کا واحد مقصد عورتوں کی تعلیم و تربیت، تہذیب اصلاح اور حمایت قرار دے دیا۔ اور اپنے ناولوں کے ذریعے سماج میں عورتوں کے درجے کو بلند کر دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ عورتوں کو تعلیم اور آزادی حاصل ہو مگر وہ مغرب کی کورانہ تقلید نہ کریں۔ ان کی قدامت پرستی دورِ جدید سے خائف ہونے کے بدلے اس کا خیر مقدم کرتی مگر اس حد تک کہ ان کے مضر اثرات سوسائٹی میں نہ پھیلیں۔ اس کے موضوعات فلسفہ یا نفسیاتی مسائل پر مبنی نہیں بلکہ اُنھوں نے زندگی کا نقشہ اس طرح کھینچا کہ معاشرت کی موجودہ خرابیاں دور ہوں یہی ان کا مقصد تھا۔ اور اس کے لیے وہ کبھی غمگین حالات کے مصوّر اور کبھی طنز و مزاح کے ادیب بن کر سامنے آتے رہے اور بلاشبہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے۔

اگر ہندوستانی سماج میں ان کے ناولوں کی وسیع اور دُور رس اثرات کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اُنھوں نے اس وسیلے سے نہ صرف پرانی تہذیب کے مٹنے پر اظہارِ افسوس کیا اور اپنے عہد کی قدروں کی نمائش کی ہے اور ہندوستانیوں بلکہ خصوصاً مسلمانانِ ہند کو فرنگی تہذیب کی تقلید سے باز رکھنے کی کوشش بھی کی۔ ان کی جد و جہد تنی

تہذیب کے خلاف نہیں تھی بلکہ اس کے تخریبی اثرات کے خلاف تھی۔ اقبال کی طرح ان کے نزدیک بھی مسلمانوں کی پستی کا سبب ان کا مذہب سے انحراف تھا اور اس کے حصول کے لیے انھوں نے اپنے لاکھوں قارئین کو نیکی اور بدی کا ایک نیا شعور بخشا۔ انھوں نے نذیر احمد، سرشار اور شرر کی روایات کو نہ صرف آگے بڑھایا بلکہ انھیں وسعت، معنویت اور گہرائی عطا کی۔ نذیر احمد کی مقصدیت، سرشار کی وسعت نظر اور شرر کی منظر کشی اور شائستہ زبان راشد الخیری کے ناولوں میں اپنی انتہائی ترقی پذیر اور نکھری ہوئی صورت میں ملتی ہے۔ اس لحاظ سے ان کے ناول اردو کے افسانوی ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔

راشد الخیری کی تصانیف:

غدر کے بعد جب ہندوستان کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور تعلیمی زندگی میں ایک زبردست تبدیلی رونما ہوئی تو اس وقت ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ نہ صرف تعلیم جدید کا حصول تھا بلکہ تعلیم سے عام بیزاری کو دور کرنا تھا۔ اس وقت سر سید نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانے کا بیڑا اٹھایا اور تعلیم کی توسیع و اشاعت کے لیے جامع منصوبے تیار کیے اور ان منصوبوں نے ملک کی تعلیمی اور اصلاحی تحریکات میں نہایت ہی اہم کردار ادا کیا۔ لیکن بدقسمتی سے ان ساری کوششوں کے پیچھے تعلیم نسواں کی گنجائش یا تو بہت کم تھی یا سرے سے تھی ہی نہیں۔ عورتوں کی اکثریت نہ صرف جاہل تھی بلکہ فرسودہ خیالات و عقائد اور غلط رسم و رواج کی بیڑیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ چنانچہ سر سید کے رفقاء میں سب سے پہلے مولوی نذیر احمد نے تعلیم نسواں کی اہمیت اور اس کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ ان کے بعد حالی، سرشار، شرر، رسوا، پریم چند اور تمام مصنفین نے اپنے ناولوں کے ذریعے نہ صرف تعلیم نسواں کو ترغیب دی بلکہ ان کے اندر صدیوں سے جاری سماجی و معاشرتی خامیوں کو بھی دور کرنے کی بھی کوشش کی۔

لیکن اردو ناول کی تاریخ میں علامہ راشد الخیری صحیح معنوں میں نذیر احمد کے جانشین تھے۔

اُنھوں نے ہمیشہ طبقۂ نسواں کے مسائل اور ان کی ذہنی کش مکش اور اُلجھنوں کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ وہ برِ صغیر کی خواتین کے محسنِ اعظم اور عورتوں کی مظلومیت کے ترجمان تھے۔ ان کا ادب ایک مقصدی ادب ہے اور اس کا بڑا مقصد اصلاحِ معاشرت اور درستئ اخلاق ہے۔ راشد الخیری نے اپنے ناولوں کے ذریعے مشرقی روایات کو قائم و باقی رکھنے کی کوشش کی۔ ان کا یہ رجحان مغربی تہذیب اور مغربی برتری کے سیلاب کو روکنے کے لیے رُونما ہوا۔ وہ اپنے ناولوں کے ذریعے وہی کام انجام دے رہے تھے جو اکبر الہ آبادی اپنی شاعری کے ذریعے کر رہے تھے۔ ان کا اصل مقصد مشرقی تہذیب اور روایات کی حفاظت کرنا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ بظاہر ان کی زندگی کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے، لیکن اصل میں اپنی قدیم تہذیب کو قائم و باقی رکھنے کا جذبہ ہی طبقۂ نسواں کی خدمت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ چونکہ ماں کی گود بچّے کا پہلا مدرسہ ہوتی ہے اور جیسا کہ ویلک اور وارن نے کہا ہے کہ:

> "خاندان ہی انسان کی زندگی کے بارے میں سارے تصورات کی تشکیل کرتا ہے۔" ؎۱

راشد الخیری نے اسی وجہ سے طبقۂ نسواں کی خدمت کو اپنا شعار بنایا۔ کیوں کہ اس کے ذریعے وہ ملک اور قوم کی خدمت کر سکتے تھے۔ مغربی تہذیب کو جڑ سے اُکھاڑنے کے لیے گھر سے بڑھ کر کوئی موزوں جگہ نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تمام ناولوں میں گھریلو زندگی محور اور مرکز کی حیثیت رکھتی ہے جس میں پورے سماج کی تبدیلیاں منعکس نظر آتی ہیں۔ کیوں کہ سب سے پہلے یہ تبدیلیاں گھریلو فضا میں پروان چڑھتی ہیں۔ راشد الخیری مغرب اور مشرق کی تہذیب کی کش مکش کو ظاہر کرتے ہوئے مشرقی

؎۱ THEORY OF LITRATURE . P. 101

بحوالہ بیسویں صدی میں اردو ناول ص ۱۲۵

تہذیب کی پاس داری اس لیے بھی کرتے ہیں کہ وہ اس میں مذہبی قدروں کو بھی چھپا ہوا دیکھتے ہیں علامہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ مغربی تمدن کی وجہ سے مذہب سے بیگانگی بڑھ رہی ہے اور مذہب سے بیگانہ ہونے کے بعد ان کے نزدیک کوئی بھی ترقی تنزل سے بھی بدتر ہو جاتی ہے

راشد الخیری کی ابتدائی تصانیف صالحات اور منازل السائرہ اصلاحی معاشرتی ناولوں میں سے ہیں، جن کی تعداد ایک درجن کے قریب ہے۔ صبح زندگی، شام زندگی، شبِ زندگی، جوہرِ قدامت، طوفانِ حیات، مصوّرِ غم کی معرکتہ الآرا تصانیف ہیں۔ صالحات راشد الخیری کی پہلی تصنیف ہے جو ۱۸۹۵ء میں مکمل ہوئی۔

بقول منشی پریم چند:

"انسانیت کا اونچا آئیڈیل پیش کیا گیا ہے۔ ایک متوسط مسلمان گھرانے کے حالات اور نیک شریف لڑکی کی پیدائش سے موت تک کے واقعات ہیں۔ صالحات کے اطوار میں جو تغیر ہوتا ہے وہ اتنی خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ حالات وہی ہیں جو ہم دیکھتے ہیں۔ مگر افسانے کا کہیں گمان نہیں ہوتا۔ محض تخیل سے صالحہ جیسی کیریکٹر کی تخلیل مشکل ہے۔ وہ تو ان صدہا لڑکیوں میں سے ایک ہے جو مصنف کی نظر سے گزریں۔ حیاتِ صالحہ محض قصہ نہیں وہ سچ مچ حیات ہے۔ اس میں بیاگرافی کی تفصیل حقیقت اور زندگی موجود ہے۔" [۱]

"منازل السائرہ" علامہ کا عظیم شاہکار ہے۔ اس میں سائرہ کی زندگی کے مختلف منازل کے حالات نہایت دلچسپ اور نصیحت آموز طریقے سے بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے تمہیدی حصے تمثیل نگاری کے اعلیٰ نمونے ہیں اور انسانی زندگی کی چار حالتوں کا نقشہ تشبیہات و استعارات میں نہایت کامیابی کے ساتھ کھینچا گیا ہے۔

---

[۱] عصمت راشد الخیری نمبر اگست ۱۹۳۶ء ص ۱۲۸

راشد الخیری نے اسلامی تاریخ بھی ناول کے پیرائے میں لکھی ہے۔ ان ناولوں کا رنگ اصلاحی ناولوں سے مختلف ہے۔ وہ چونکہ مسلم خواتین کی اصلاح کا بیڑا اُٹھا چکے تھے، اس لیے اُنھیں خواتین کی حالتِ زار کی طرف متوجہ ہونا پڑا چونکہ دنیا کی ہر قوم کو اغیار کے مقابلے میں اپنے بزرگوں کے حالات سے زیادہ دل چسپی ہے، اس لیے مسلم خواتین کے لیے تاریخِ اسلام سے زیادہ اور کیا چیز دلچسپ ہو سکتی ہے اس لیے علامہ نے اس طرف توجہ فرمائی۔ اور چونکہ تاریخِ اسلام پر عبور حاصل تھا، اس لیے اُنھوں نے تاریخی واقعات کو ایک ماہرِ فنِ ناول نگار کے اُنھیں زندہ جاوید ناولوں اور افسانوں کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اُنھوں نے کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کے سامنے ایسی خواتین پیش کی جائیں جو اخلاق عادات اور اطوار میں ان کی خواتین کی قابلِ تقلید ہوں۔ یاسمین و شام میں بلقیا کا کریکٹر زبردست ہے۔ وہ ہر مصیبت کا سامنا کرتی ہے، لیکن وفاداری، شرافت اور اخلاق کی راہ سے قدم نہیں ڈگمگاتی۔ یہی حال طرابلس کی حسینہ سفیریہ کا ہے۔

ان ناولوں کا مقصد مسلمانوں کو تاریخِ اسلام سے آشنا کرانا بھی تھا اور پھر اس دل چسپ طریقے سے کہ تفریحِ طبع بھی ہو جائے اور تاریخِ اسلام سے متعلق مفید باتیں بھی معلوم ہو جائیں۔ یاسمین و شام، محبوبۂ خداوند، عروسِ کربلا، امینؔ کا دمِ واپسیں اور شہنشاہ کا فیصلہ ان ناولوں میں ابتدائے اسلام سے لے کر زوالِ بغداد تک کے حالات بیان کیے گئے ہیں اور ہلال و صلیب کی لڑائیوں، اسلام و عیسائیت کے معرکوں اور ایمان و کفر کے مقابلوں کا تذکرہ ہے۔ یہ تمام تاریخی ناول دلّی کی ٹکسالی زبان میں لکھے گئے ہیں اور تقریباً ایک درجن سے زیادہ ہیں۔ ان ناولوں میں حُسن و عشق کی چاشنی بھی ہے اور درس و نصیحت کے پہلو بھی۔ اس نوع کے ناولوں میں آفتابِ دمشق، ماہِ عجم، شاہین و درّاج وغیرہ دل ہلا دینے والے غم انجام ناول ہیں۔ اُنھوں نے اپنے تاریخی ناولوں کو اپنے معاصرین کی طرح صرف داستانِ حسن و عشق اور جنگ و جدال نہیں بنایا بلکہ کام کی باتیں تحریر کر کے اردو کے بہترین تاریخی ناول بنائے۔ ان کے تاریخی ناول میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو تجربہ و مشاہدہ کی کسوٹی پر پوری نہ اُتر سکے یا جس کی تاریخی شہادت نہ مل سکے برخلاف اس کے ان کے معاصرین کے بعض ناولوں میں ایسے واقعات تحریر ہیں جن کی نہ صرف تاریخی شہادت

ملنی دشوار ہے بلکہ وہ غیر فطری معلوم ہونے لگتے ہیں۔ راشد الخیری کے ناولوں کے مطالعے کے وقت ہمارے دل میں جو احساس پیدا ہوتا ہے وہ اصلاح کا سب سے بڑا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ان کے ناول نہ صرف ان کے خیالات کے حامل ہیں بلکہ قاری کے خیالات بھی ہمدردی سے بھرپور ہو جاتے ہیں۔ ماہِ عجم سے متعلق نواب بہادر جنگ نے ایک مجمع میں کہا تھا۔

"اکیس مرتبہ پڑھ چکا ہوں اور جی چاہتا ہے پھر پڑھوں"۔ [۱]

ان کے تاریخی ناولوں کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ شاہین و دراج کی دو قسطیں رسالہ مخزن میں شائع ہوئی تھیں کہ اس کے خریداروں میں سات سو کا اضافہ ہو گیا تھا۔ [۲]

زبان کے لحاظ سے ان کے تاریخی ناول دلی کے محاورات اور روزمرہ کے اُن مول خزانے میں جن کا مطالعہ ہمیں دلی کے شریف گھرانوں کی زبان سے روشناس کرا دیتا ہے۔ مگر اصلاحی و معاشرتی ناولوں میں ٹھیٹ عورتوں کی بولی اور آبِ کوثر میں دھلا ہوا روزمرہ ہے۔ ان میں پاکستانی ہندوستانی گھرانوں کی معاشرت ہر طبقے کی دکھائی گئی ہے اور پیدائش سے موت تک کے واقعات جو عورت کی زندگی میں پیش آتے ہیں، انھیں موثر پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

اخلاقی درستی اور معاشرت و تمدن کی اصلاح کی غرض سے راشد الخیری نے ناول ہی نہیں بلکہ ڈیڑھ درجن طویل افسانے لکھے ہیں جن میں جوہرِ عصمت، قطراتِ اشک، سیلابِ اشک، طوفانِ اشک، خدائی راج، نسوانی زندگی، گلدستۂ عید، گوہرِ مقصود، گردابِ حیات، بساطِ حیات، حور اور انسان وغیرہ کافی مشہور رہیں۔ اس کے علاوہ کم و بیش پندرہ مختصر افسانوں کے مجموعے جن میں ان کا مخصوص رنگ، مصلحانہ روش اور پند و نصائح سے ترتیب دیا ہوا ہے اور جس میں راشد الخیری نے بطور ایک سوشل ریفارمر مخصوص انداز کے ساتھ تہذیب

---

[۱] دیباچہ منازل السائرہ ۱۹۷۶ء ص ۱۳

حوالہ [۲] ایضاً " " "

نسواں اور ادبی تمدّنی تہذیبی روایات کے تحفظ کا جتن کیا ہے اور مغربی نکر کے نتیجے میں پیدا ہونے والی زندگی کے اُمڈتے ہوئے طوفان پر بند باندھنے کی کوشش کی ہے جو ان کی نظر میں مشرقی تنزّل عقائد و روایات کے لیے ضرر رساں تھا۔

اصلاحی، معاشرتی اور تاریخی ناولوں اور افسانوں کے علاوہ راشد الخیری کی مطبوعہ نظموں کے دو مجموعے بھی ہیں۔ ایک رودادِ قفس اور دوسرا گرفتارِ قفس۔ ان نظموں میں بھی علامہ نے مسلم متوسط طبقے کی عورت کے حالات پر آنسو بہائے ہیں۔ وہ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ ہمارے گھروں کے اندر ہماری عورتوں کی حالت کسی طرح بھی ننھے ننھے ان بے زور اور بے طاقت پرندوں سے کم نہیں جنھیں انسان محض اپنی تفریحِ طبع کی خاطر کھُلی ہوا اور آزادانہ پرواز سے محروم کرکے ایک پنجرے میں بند کر دیتا ہے۔ وہ بجا طور پر فرقۂ نسواں کو اسیرانِ قفس سمجھا کرتے تھے۔ اور اسی رعایت سے ان نظموں کے مجموعے کے نام پسند کیے۔

راشد الخیری مصورِ غم تھے۔ اُنھوں نے انسان کو رُلا کر اس میں ہمدردی کا احساس پیدا کیا اور کئی زندگیوں میں خزاں کو بہار اور گریہ کو تبسم سے بدلا اس لیے اُنھیں ہم مصلحِ نسواں کا لقب دیتے ہیں، لیکن اس مصورِ غم کو لوگوں کے رُلانے کے ساتھ ساتھ ہنسانا بھی آتا تھا۔ کیوں کہ جب تک آدمی میں ہنسا سکنے کی صلاحیت نہ ہو وہ رُلا بھی نہیں سکتا۔ راشد الخیری نے جس موضوع کو اپنا موضوع بنایا اور جن حالات میں بنایا اس کا تقاضا یہی تھا کہ اپنے انداز میں سوز پیدا کیا جائے۔ وہ سوز اُنھوں نے پیدا کیا اور اسی سوز نے اُنھیں مصورِ غم بنایا، لیکن فن کاری کا تقاضا یہ تھا کہ کبھی کبھی اپنے منصب سے ہٹ کر زندگی کے دوسرے پہلو کو بھی سمجھنا سیکھو۔ راشد الخیری نے ادب کو بہت کچھ ایسا دیا کہ اس سے ان کی ظرافتِ طبع اور مزاح نگاری کے شگفتہ اور متبسم پہلو کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ان کے مجموعے مزاحیہ افسانوں کے ہیں جن میں نانی عشو، دادا لال بھبکڑ اور ولایتی ننھی بہت مشہور ہیں۔

اس کے علاوہ سیاسی و صحافتی مضامین نیز مذہبی مضامین کے مجموعوں کی تعداد بھی ایک درجن کے قریب ہے اور ایک درجن تصانیف مختلف موضوعات پر موثر مضامین کے مجموعوں کی ہیں جو بعد رحلت کتابی صورت میں کئی بار شائع ہوئے۔

راشد الخیری اپنے کسی مضمون یا کتاب کو ختم کرنے کے بعد اس پر نظرِ ثانی نہیں کرتے تھے اور نہ کبھی مسودہ صاف کرتے۔ فرماتے تھے :

"جتنی دیر میں نظرِ ثانی کروں، اتنی دیر میں ایک اور کتاب کیوں نہ لکھ لوں"۔ [۱]

راشد الخیری نے اپنے مناسب حال اپنا ہی جدید اسٹائل وضع کیا اور وہ اس قدر موثر اور دل کش ثابت ہوا کہ کسی اور انشا پرداز کو میسر نہ آسکا۔ وہ اپنی طرز کے خاص امام تھے۔ وہ جب تک زندہ رہے اِس طرز کے بلا شرکت غیرے مالک رہے اور ان کے انتقال کے ساتھ ساتھ یہ طرز بھی فنا ہو گیا۔

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

راشد الخیری کا شمار دلّی کے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ اُنھوں نے افسانے بھی لکھے اور ناول بھی اور ہماری ادبی صحافت کی تاریخ میں بھی اُنھیں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ اُنھوں نے عورتوں کے مسائل پر بہت کچھ لکھا اور ان کی سماجی حیثیت کو بہتر بنانے اور ان میں حقوق کی پاس داری کا احساس پیدا کرنے کے لیے وہ مسلسل تحریر و تقریر کے ذریعے اپنی بات دوسروں کے دلوں تک پہنچاتے رہے۔

راشد الخیری کی مطبوعہ تصانیف سات درجن سے زیادہ ہیں جنھیں مختلف حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

راشد الخیری کی ابتدائی تصانیف اصلاحی و معاشرتی ناول :

مصنف کی سب سے پہلی تصنیف جو شائع ہوئی وہ بے شک صالحات، حیاتِ صالحہ ہے۔ لیکن اس سے بھی پہلے اُنھوں نے ایک عشقیہ ناول احسن و میمونہ لکھا تھا

---

[۱] منازل السائرہ ۱۹۷۶ء ص ۱۴۰

جسے اپنے پھوپھا ڈاکٹر نذیر احمد کی ناراضگی کی وجہ سے ضائع کر دیا تھا۔

خود مصنف کا بیان اس تصنیف سے متعلق دیباچہ صالحات آٹھواں ایڈیشن ص ۸-۷ پر ہے جس کا مفہوم ہے :

"سب سے پہلے میں نے ایک فضول سا قصہ احسن و میمونہ لکھا تھا جو بریلی کے ایک اخبار میں چھپتا تھا۔ بڑے پھوپھا ابا کو جب معلوم ہوا تو وہ بہت خفا ہوئے کہ ایسے لغو قصے لکھتے ہو۔ جیسی کتابیں میں لکھتا ہوں ویسی کیوں نہیں لکھتے۔ میں نے مرأۃ العروس اور توبۃ النصوح کا مطالعہ کیا تو خیال پیدا ہوا کہ ایسی کتابیں لکھنا کون سی بڑی بات ہے میں بھی لکھ سکتا ہوں چنانچہ صالحات شروع کر دی۔ جب بڑے پھوپھا ابا نے 'صالحات' دیکھی تو بہت خوش ہوئے۔"

۱۔ صالحات :

تصنیف ۱۸۹۶ء یا ۱۸۹۷ء طبع اول، دہلی

اس ناول میں بقول پریم چند انسانیت کا اونچا آئیڈیل پیش کیا گیا ہے۔

طبع دوم: دہلی۔ ۱۹۰۷ء طبع سوم دہلی ۱۹۳۰ء

۲۔ منازل السائرہ :

تکمیل ۱۸۹۸ء طبع اول، علی گڑھ ۱۹۰۲ء۔ یہ ناول علی گڑھ میں محمد احسن وکیل نے شائع کروایا۔

۳۔ صبحِ زندگی :

تکمیل ۱۹۰۷ء طبع اول۔ مخزن پریس، دہلی ۱۹۰۹ء

(۱۹۳۵ء تک اس کتاب کے ۱۸ ایڈیشن شائع ہوئے)

۴۔ شامِ زندگی :

۱۹۱۷ء طبع اول، دہلی۔

۵۔ شبِ زندگی :

حصہ اول ۱۹۱۹ء طبع اول ۱۹۱۹ء تمدن پریس دہلی

شبِ زندگی (حصہ دوم)

جنوری ۱۹۲۳ء میں اپنی بہو خاتون اکرم کی راہ نمائی کے لیے محض پانچ ہفتوں میں مکمل کی۔ ۱۹۶۴ء کے بعد کے ایڈیشن میں جلد اوّل اور دوم کو یک جا کر دیا گیا۔

نوحۂ زندگی :

۱۹۲۷ء میں طبعِ اوّل دہلی۔ ۱۹۳۱ء کے ایڈیشن پر مصنف نے نظرِ ثانی کر کے دیباچے کا جدید اضافہ فرمایا۔

۶۔ **جوہرِ قدامت :**

تکمیل ۱۹۰۰ء طبع اوّل ۱۹۱۹ء اس ناول پر کئی فلمیں بنیں۔ قیامِ پاکستان سے قبل مدراس یونیورسٹی میں نصابی کتب رہی۔ راشد الخیری نے جنوری ۱۹۳۲ء میں نظرِ ثانی فرمائی۔ ۱۹۶۴ء تک اس کے آٹھ ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔

۷۔ **طوفانِ حیات :**

۱۹۱۷ء طبع اوّل، لاہور ۱۹۳۰ء

طوفانِ حیات ہندوستان کا بہترین اصلاحی ناول کہا جاتا ہے۔

۸۔ **تربیتِ نسواں :** ۱۹۲۳ء مطبوعہ لاہور طبع اوّل ۱۹۲۳ء

اس ناول کا دوسرا نام سمرنا کا چاند تھا۔

۹۔ **بزمِ آخر :**

۱۹۱۸ء کی تصنیف ہے۔ مگر کسی وجہ سے کتابی صورت میں شائع نہ ہو سکا تھا۔ راشد الخیری کی رحلت کے بعد ۱۹۶۴ء میں عصمت بک ڈپو کراچی سے ہر ماہ تھوڑا تھوڑا شائع ہوا۔

اسلامی تاریخ بہ طرزِ ناول :

۱۔ **آفتابِ دمشق :** ۱۹۲۸ء طبع اوّل۔ گیلانی الیکٹرک پریس لاہور۔ گجراتی زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ ۱۹۶۰ء سے یہ کتاب پنجاب یونیورسٹی کے ادیبِ عالم امتحان میں شامل ہے۔

۲۔ **ماہِ عجم : ۱۹۱۸ء**

یہ ناول امتیاز علی تاج نے ۱۹۱۸ء میں "تہذیبِ نسواں" لاہور کے لیے لکھوایا تھا۔ یہ مصنف کا پہلا تاریخی ناول ہے۔

۳۔ **عروسِ کربلا : ۱۹۱۹ء طبع اوّل۔ پنڈی بہاؤالدین**

۱۹۳۳ء والے ایڈیشن پر نظرِ ثانی کر کے ترمیم و اضافے بھی کیے۔

۴۔ **یاسمین و شام : طبع اوّل ۱۹۳۱ء پنڈی بہاؤالدین کُل سات ایڈیشن**

یہ ناول پونے دو سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

۵۔ **تیغِ کمال : طبع اوّل ۱۹۲۳ پنڈی بہاؤالدین**

راشد الخیری نے یہ ناول گنگا پور میں صرف ایک ہفتہ میں مکمل کیا تھا۔ یہ کتاب چھ بار طبع ہوئی۔

۶۔ **منظر طرابلس : طبع اوّل ۱۹۳۹ء۔ کُل صفحات ۴۰۔ چھ بار طبع ہوا۔**

مطبوعہ عصمت بک ڈپو دہلی۔

۷۔ **شہنشاہ کا فیصلہ : طبع اوّل ۱۹۲۹ء عصمت بک ڈپو دہلی**

یہ ناول پہلے 'خطیب' ۱۹۱۷ء میں شائع ہوا تھا۔ کُل صفحات ۳۲۔ سات بار طبع ہوا۔

۸۔ **درِ شہوار : طبع اوّل ۱۹۲۱ء عصمت بک ڈپو دہلی**

۹۔ **شاہین و درّاج : ۱۹۰۸ء مخزن لاہور میں قسط وار شائع ہوا۔**

طبع اوّل ۱۹۰۸ پنجاب لاہور طبع دوم ۱۹۴۰ء

۱۰۔ **محبوبۂ خداوند : ۱۹۱۱ء چار ماہ میں ختم کی تھی۔ ۱۹۳۱ء میں چوتھی مرتبہ طبع ہوئی۔**

طویل اور مختصر افسانے :

راشد الخیری کی ۴۸ تصانیف ایسی ہیں جن میں افسانے اور افسانہ نُما تحریریں شامل ہیں جو حسبِ ذیل ہیں :

۱۔ سات روحوں کے اعمال نامے (۱۹۱۷ء) ۲۔ بنت الوقت (۱۹۱۸ء)

۳۔ سراب مغرب (۱۹۱۸ء)
۴۔ سنجوگ (۱۹۱۸ء)
۵۔ انگوٹھی کا راز (۱۹۱۸ء)
۶۔ گوہر مقصود (۱۹۱۸ء)
۷۔ موودہ (۱۹۱۹ء)
۸۔ فسانۂ سعید (۱۹۲۰ء)
۹۔ قطرات اشک (۱۹۲۱ء)
۱۰۔ سوکن کا جلاپا (۱۹۲۱ء)
۱۱۔ جوہر عصمت (۱۹۲۱ء)
۱۲۔ سنتوشی (۱۹۲۶ء)
۱۳۔ گلدستۂ عید (۱۹۲۷ء)
۱۴۔ منازل ترقی (۱۹۲۷ء)
۱۵۔ بچّہ کا کُرتا (۱۹۲۷ء)
۱۶۔ ویڈیا کی سرگزشت (۱۹۲۷ء)
۱۷۔ امین کا دم واپسیں (۱۹۲۷ء)
۱۸۔ قلب حزیں (۱۹۲۸ء)
۱۹۔ نانی عشو (۱۹۲۸ء)
۲۰۔ سیلاب اشک (۱۹۲۸ء)
۲۱۔ طوفان اشک (۱۹۲۹ء)
۲۲۔ شہنشاہ کا فیصلہ (۱۹۲۹ء)
۲۳۔ شہید مغرب (۱۹۲۹ء)
۲۴۔ تمغۂ شیطانی (۱۹۲۹ء)
۲۵۔ تفسیر عصمت (۱۹۲۹ء)
۲۶۔ ولایتی نبھی (۱۹۲۹ء)
۲۷۔ دادا لال بجھکڑ (۱۹۳۰ء)
۲۸۔ نسوانی زندگی (۱۹۲۱ء)
۲۹۔ سودائے نقد (۱۹۳۲ء)
۳۰۔ غدر کی ماری شہزادیاں (دہلی میں میلہ) ۱۹۳۲ء
۳۱۔ جہار عالم (۱۹۳۵ء)
۳۲۔ سلی ہوئی پتیاں (۱۹۳۷ء)
۳۳۔ دلی کی آخری بہار (۱۹۳۷ء)
۳۴۔ گرداب حیات (۱۹۳۷ء)
۳۵۔ بساط حیات (۱۹۳۷ء)
۳۶۔ حور اور انسان (۱۹۳۷ء)
۳۷۔ نشیب و فراز (۱۹۳۷ء)
۳۸۔ خدائی راج (۱۹۳۸ء)

مذکورہ بالا تصانیف میں سے ۱۹ تصانیف، ایک تا ۵، ۷، ۱۰، ۱۲، ۱۴ تا ۱۷، ۲۲، ۲۴ تا ۲۶، ۲۹، ۳۱ ناولٹ کے قریب ہیں۔ جنھیں عصمت کے بعض اشتہاروں میں ناول بھی کہا گیا ہے۔ قلب حزیں کی نوعیت بھی انشائی مضامین کے مجموعے کی سی ہے۔ باقی ۱۸ تصانیف میں تحریریں ہیں جنھیں اس بنا پر افسانے کہا جا سکتا ہے جس کا مظاہرہ تاریخ ادب کے اولین مرحلے میں کیا جاتا ہے۔ اگرچہ اب راشد الخیری کی ہر موجودہ تصنیف کے آخر میں

عصمت بکڈپو دلی کی جانب سے دیے گئے اشتہار میں مندرجہ ذیل مجموعوں کو افسانوی مجموعے قرار دیا گیا ہے:

مختصر افسانوں کے مجموعے:

۱۔ جوہرِ عصمت ۲۔ سیلابِ اشک ۳۔ طوفانِ اشک ۴۔ قطراتِ اشک ۵۔ خدائی راج ۶۔ نسوانی زندگی ۷۔ گلدستۂ عید ۸۔ گوہرِ مقصود ۹۔ گردابِ حیات ۱۰۔ بساطِ حیات ۱۱۔ حور اور انسان ۱۲۔ نشیب و فراز۔

اصلاحی و معاشرتی افسانے:

۱۔ بنت الوقت ۲۔ سرابِ مغرب ۳۔ فسانۂ سعید ۴۔ سودائے نقد ۵۔ تمغۂ شیطانی ۶۔ سات روحوں کے اعمال نامے ۷۔ سنتوشی ۸۔ غدر کی ماری شہزادیاں ۹۔ سنجوگ۔ ۱۰۔ سوکن کا جلاپا ۱۱۔ موؤدہ ۱۲۔ نصیرِ عصمت ۱۳۔ انگوٹھی کا راز ۱۴۔ منازلِ ترقی ۱۵۔ بچہ کا کرتا ۱۶۔ ویدیا کی سرگزشت ۱۷۔ جہارِ عالم

مزاحیہ افسانے:

۱۔ نانی عشو ۲۔ دادا لال بھبکڑ ۳۔ ولایتی تھی۔

ان افسانوں کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں اور تمام تصنیف عصمت بک ڈپو دہلی سے شائع ہوئیں۔

۱۔ گوہرِ مقصود: (۱۹۱۸ء۔ نو افسانے)

۱۔ خیالستان کی پری (عصمت ۱۱) ۲۔ لعل کی تلاش (عصمت، جون جولائی ۱۰)

۲۔ قطراتِ اشک: (۱۹۲۱ء۔ تیرہ افسانے)

۱۔ ایک مظلوم بیوی کا خط (کثرتِ ازدواج مخزن ۱۹۰۸ء) ۲۔ عصمت و حسن (مخزن ۱۹۰۷ء) ۳۔ بد نصیب کا لال (مخزن اگست ۱۹۰۵ء) ۴۔ رویائے مقصود (مخزن اکتوبر ۱۹۰۷ء)

۵۔ سارس کی تارک الوطنی (مخزن ۱۹۰۹ء) ۶۔ نند کا خط بھاوج کے نام (عصمت جون ۱۹۰۸ء)
۷۔ ساون کی چڑیا (عصمت ۱۹۱۰ء) ۸۔ مظلوم کی فریاد (عصمت ۱۹۱۱ء)
۹۔ ماہ جبیں اندرا (تمدن ۱۹۱۱ء) ۱۰۔ دارالغرور (مخزن ۱۹۰۶ء)
۱۱۔ نند بھاوج کی خط و کتابت (تمدن ۱۹۱۲ء) ۱۲۔ چاندنی چوک کا جنازہ (کہکشاں ۱۹۱۱ء)
۱۳۔ جھولے کی یاد (تہذیب نسواں ۱۹۲۱ء)

۳۔ **جوہرِ عصمت:** (۱۹۲۱ء تیرہ افسانے)

پہلے ایڈیشن میں صرف تین افسانے تھے اور ضخامت ۴۸ صفحے تھے۔ طبع دوم ۱۹۲۷ء کے ایڈیشن میں مزید دس افسانے شامل کر دیے گئے۔

۱۔ مظلوم بیوی کا پاک جنازہ ۲۔ بھنور کی دلہن ۳۔ فسانۂ تنویر ۴۔ مامون رشید کا دربار ۵۔ اگلی محبتیں ۶۔ جہانگیری عدل ۷۔ ملکہ شہزاد ۸۔ بلبل کی شہادت۔ ۹۔ بے گناہ کا قتل ۱۰۔ برقع کی مستحق ۱۱۔ بھاوج کا کنبہ ۱۲۔ غلط فہمی ۱۳۔ خاتمہ بالخیر۔

۴۔ **گلدستۂ عید:** (۱۹۲۷ء۔ نو افسانے)

۱۔ مسلمان فیشن ایبل خاتون کی ڈائری ۲۔ اُمِ جعفر کی عید ۳۔ عید کا چاند نمودار ہوا۔ ۴۔ کنواری بیٹی کو عید کی مبارکباد ۵۔ سہاگن کی عید ۶۔ بچوں والے کی عید ۷۔ خرید کر ملیں جنتی دعائیں ناتواں ۸۔ رویائے خجستہ۔

۵۔ **نانی عشو:** (۱۹۲۸ء۔ چار افسانے)

۱۔ نانی عشو ۲۔ رضائی ۳۔ سجدۂ ندامت ۴۔ عرب اور گلشن۔

۶۔ **سیلابِ اشک:** (۱۹۲۸ء۔ سات افسانے)

۱۔ پرستارِ محبت (جولائی ۲۰) ۲۔ بلوچن کے تین رنگ (جنوری ۲۷)
۳۔ طلاقن کا سفید بال (اپریل ۲۶) ۴۔ حجِ اکبر (جولائی ۲۶) ۵۔ عدلِ گلبدن (اپریل ۲۷)
۶۔ بے قصور بچی (اپریل ۲۰) ۷۔ ثریا کا تخیل (عصمت ۲۶) یہ تمام افسانے عصمت اور تمدن میں شائع ہوئے۔

۷۔ **طوفانِ اشک:** (۱۹۲۶ء۔ گیارہ افسانے) (فٹ نوٹ اگلے صفحے پر دیکھیے)

۱۔ محروم وراثت ۲۔ بیوی کی صحنک پر بیوہ لڑکی ۳۔ رواج کی بھینٹ۔

۴۔ سوتیلی ماں کا آخری وقت ۵۔ اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے ۶۔ شہیدِ معاشرت ۷۔ توصیف کا خواب ۸۔ تغیرِ عبادت ۹۔ نئی دلہن ۱۰۔ میں نے کیا دیکھا ۱۱۔ دلہن دونوں کی۔

۸۔ **شہیدِ مغرب**: (۱۹۲۹ - آٹھ افسانے)

۱۔ شہیدِ مغرب (فروری ۱۹۱۲ء) ۲۔ آسمانی مسافر (اپریل ۱۹۱۲ء) ۳۔ شہیدِ طرابلس مارچ ۱۲) ۴۔ طرابلس سے ایک صدا (دسمبر ۱۹۱۱ء) ۵۔ سیاہ داغ (۱۹۱۹ء ۶۔ افراط و تفریط (نومبر ۲۴) ۷۔ گلو تتیاں (۱۹۲۶ء) ۸۔ میمونہ (دسمبر ۱۹۱۲ء)

۹۔ **دادا لال بجھکڑ**: (۱۹۳۰ء - پانچ افسانے)

۱۔ دادا لال بجھکڑ (۱۹۳۰ء) ۲۔ مولوی صاحب کا وعظ ۳۔ شاہدرہ پل ۴۔ بھائی ظفر اقرار نامہ لکھ رہے ہیں ۵۔ کبڑی بیگم

۱۰۔ **نسوانی زندگی**: (۱۹۳۱ء - تین افسانے)

۱۔ مامتا ۲۔ فرشتہ بیوی ۳۔ اشکِ ندامت

۱۱۔ **غدر کی ماری شہزادیاں** (بلا میں میلہ) ۱۹۲۳ء - تیرہ افسانے

۱۔ گوہری تنو ۲۔ شہزادی منظفر سلطان بیگم کی سرگزشت ۳۔ شہزادی زہرہ بیگم کی داستان ۴۔ شہزادی قمر آرا بیگم کی بپتا ۵۔ شہزادی قیصر جہاں کی آپ بیتی ۶۔ شہزادی برجیس دلہن کی سرگزشت ۷۔ مینا بازار ۸۔ فاتحہ ۹۔ ننھی حیدری کی آپ بیتی ۱۰۔ شہزادی قمر جہاں کی بپتا ۱۱۔ حمید مختبر ۱۲۔ میلے کے بعد ۱۳۔ بوا قمرا

۱۲۔ **مسلی ہوئی پتیاں**: ۱۹۲۷ء - گیارہ افسانے

اس مجموعے میں گیارہ افسانے خطوط کے پیرائے میں لکھے گئے ہیں۔ بڑی بہن کا خط کے عنوان سے اردو کا اولین افسانہ "نصیر اور خدیجہ" بھی شامل ہے۔

۱۳۔ **دلی کی آخری بہار**: ۱۹۳۷ء چودہ افسانے

۱۔ بھکارن شہزادی، ۲۔ گٹھری والی شہزادی ۳۔ جھیرن شہزادی ۴۔ جھولے کی یاد

(پچھلے صفحہ کا فٹ نوٹ) لہ طوفانِ اشک کے سرورق پر بارہ مختصر افسانے لکھا ہے، مگر "کلنک کا ٹیکہ" وہ تقریر ہے جو راشد الخیری نے دسمبر ۱۹۲۵ء میں انجمن حمایت الاسلام کے سالانہ جلسے میں کی۔

۵۔ بہادر شاہ کی بھانجی ۶۔ نند کے قدموں پر ۶۔ تیرا کن اماں ۷۔ اگلے دلوں کی وضع داری ۸۔ دلی کے بچھڑے لکھنؤ میں ۹۔ فسانۂ شب ۱۰۔ کارزار حیات ۱۱۔ شاہی میلہ ۱۲۔ لال داڑھی والے مرزا صاحب ۱۳۔ بہادر شاہی لال ۱۴۔ خان والی اماں۔

۱۴۔ **گرداب حیات** : ۱۹۳۷ء پچیس افسانے

۱۔ ڈائن ماں ۲۔ طلاق ۳۔ مایوں کی دلہن ۴۔ جگادھرن ۵۔ بن باپ کا بچہ ۶۔ بیوی کا آخری سانس ۷۔ سیدانی کی وفاداری ۸۔ بہو بیگم کی ندامت ۹۔ موئی مٹی کی نشانی ۱۰۔ دو دن سلطان بیگم کے ساتھ ۱۱۔ ایسی بیاہی سے کنواری بھلی ۱۲۔ بی انجم ۱۳۔ کائنات کا مطالعہ ۱۴۔ ضمیر کی آواز ۱۵۔ شوہر کا استقبال ۱۶۔ نند کا شکار ۱۷۔ امینہ بنت اطہر ۱۸۔ عالم بالا کی ایک روح ۱۹۔ بیوی مسلمان شوہر کی نگاہ میں ۲۰۔ شادی کی ندامت ۲۱۔ انتظار ۲۲۔ کیا لڑکیوں کی پیدائش ماں کا قصور ہے؟ ۲۳۔ سلطانہ کے وعدے کا انتظار ۲۴۔ دو معصوم آنسو۔

۱۵۔ **بساط حیات** : ۱۹۳۷ء چار افسانے

۱۔ بے زبانوں کا اثر ۲۔ حیات انسانی پر دو پرندوں کی بحث ۳۔ داستان بلبل اسیر ۴۔ جانور کون ہے؟

۱۶۔ **حور اور انسان** : چھ افسانے

۱۔ ضمیرہ ۲۔ شرح کا خون ۳۔ پریوں کی محفل ۴۔ انتہائے محبت ۵۔ رابعہ نازلی کا دم واپسیں ۶۔ ایک روح کی سرگزشت

۱۷۔ **نشیب و فراز** : ۱۹۳۷ء آٹھ افسانے

۱۔ نصیرہ بیگم کی لوری اور میں ۲۔ معزز قیدی ۳۔ روزہ دار ماما ۴۔ بلبل اسیر ۵۔ فضول خرچی کا انجام ۶۔ بے شک اماں جان نے غلطی کی ۷۔ سوکن کی نصیحت ۸۔ ایک کنواری لڑکی کے چند گھنٹے۔

۱۸۔ **خدائی راج** : ۱۹۳۸ء سات افسانے

۱۔ جہیز کا جھولا ۲۔ خدا فراموش ۳۔ باسٹھ برس کے تین دن ۴۔ تین بہنیں ۵۔ خاتمہ بالخیر ۶۔ اس مسکراہٹ کی قیمت ۷۔ خدائی راج۔

مضامین کے متفرق مجموعے:

۱۔ عروسِ مشرق ۲۔ گدڑی کا لال ۳۔ مسلمان عورت کے حقوق ۴۔ نالۂ زار
۵۔ بلبلِ بیمار ۶۔ ساجن موہنی ۷۔ فریبِ ہستی ۸۔ بے فکری کا آخری دن
۹۔ چمنستانِ مغرب ۱۰۔ بکھری ہوئی پتیاں ۱۱۔ شادی کا انتخاب

مذہبی مضامین:

۱۔ محسنِ حقیقی: طبع اول ۱۹۳۷ء دہلی
(اس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے متعلق چودہ مضامین جو پہلی بار نظام المشائخ دہلی میں طبع ہوئے تھے)
۲۔ زیورِ اسلام۔ طبع اول ۱۹۳۸ء
۳۔ احکام نسواں ۱۹۳۷ء دہلی
۴۔ دعائیں۔ نظم نثر طبع اول ۱۹۳۷ء عصمت دہلی
۵۔ قرآنی قصے طبع اول ۱۹۳۶ء عصمت دہلی

تاریخ و سیر:

۱۔ آمنہ کا لال (مولود شریف) طبع اول دسمبر ۱۹۳۰ء عصمت بک ڈپو
۲۔ سیدہ کا لال (تاریخ شہادت) طبع اول جولائی ۱۹۲۱ء عصمت دہلی
۳۔ وداعِ خاتون (۳ مضامین) دہلی طبع اول ۱۹۳۹ء راشد الخیری نے یہ تین مضامین اپنی جواں مرگ بہو خاتون اکرم سے متعلق ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۵ء میں "مہمان دو دن" "نصرت نامہ" اور "آپ بیتی" کے نام سے لکھے گئے۔
۴۔ وداعِ ظفر یعنی نوبت پنج روزہ (تاریخ) طبع اول نومبر ۱۹۲۸ء بہادر شاہ ظفر کے عہد سے متعلق ہے۔
۵۔ الزہراء (فاطمہ زہرہ کی سوانح حیات) طبع اول ۱۹۱۷ء دہلی

۶۔ بزمِ رفتگاں (خاکے) طبع اوّل ۱۹۳۶ء عصمت بک ڈپو دہلی
۷۔ دلی کی آخری بہار طبع اوّل ۱۹۳۷ء عصمت دہلی (اس میں ۵ ۲ مضامین ہیں جن میں دلی کا مرثیہ لکھا گیا ہے۔
۸۔ داستانِ پارینہ (مضامین) طبع اوّل ۱۹۳۷ء دہلی
(غیر مسلم متعصب مورخین کے اعتراضات کا ۱۸ تاریخی مضامین میں جواب)

سیاست، صحافت اور سیاحی:

۱۔ عالمِ نسواں (مضامین) طبع اوّل ۱۹۳۸ء عصمت بک ڈپو، دہلی
۲۔ سیاحتِ ہند (سفرنامے) طبع اوّل ۱۹۳۵ء دہلی
(اگست ۳۶۔ ۳۳۔ ۲۳ میں تربیت گاہ بنات کے سلسلے میں جو دورے کیے ان کے حالات عصمت، بنات، رہبرِ دکن اور تنظیم میں شائع ہوئے)

ادبِ لطیف و انشاء:

۱۔ قلبِ حزیں (مضامین) دہلی طبع اوّل ۱۹۲۸ء
(یہ ۳۰ مضامین اور افسانے راشد الخیری نے س۔ش۔ر کے قلمی نام سے لکھے تھے جو ۱۹۲۷ء تک دہلی عصمت میں شائع ہوئے تھے)
۲۔ لڑکیوں کی انت (زنانہ خط و کتابت پر) عصمت دلی طبع اوّل ۱۹۱۱ء
۳۔ مسلی ہوئی پتیاں (مضامین۔ افسانے) طبع اوّل ۱۹۳۷ء عصمت دہلی
(۱۱ افسانوں کا مجموعہ۔ تمام افسانے خطوط کے انداز میں لکھے ہوئے ہیں۔ اس مجموعہ میں بڑی بہن کے نام سے اردو کا اوّلین افسانہ "نصیر اور خدیجہ" مطبوعہ ۱۹۰۳ء مخزن لاہور بھی شامل ہے)

شاعری:

۱۔ گرفتارِ قفس (شعری مجموعہ) طبع اوّل ۱۹۳۱ء۔ عصمت بک ڈپو، دہلی

اس میں نظمیں، سلام اور پہیلیاں ہیں۔

۲۔ رودادِ قفس (شعری مجموعہ)

طبع اول ستمبر ۱۹۱۸ء ۱۹۱۸ء (راشد الخیری کی وہ نظمیں ہیں جو افسانوں مضامین کے ساتھ شائع ہوئی تھیں)

کتابیات

فہرست کتب	مصنف	سن اشاعت	مقام اشاعت
۱۔ سرابِ مغرب	راشد الخیری	۱۹۲۷ء	دہلی
۲۔ حیاتِ صالحہ	"	۱۹۴۶ء	عصمت بک ڈپو دہلی
۳۔ شبِ زندگی	"	۱۹۴۳ء	"
۴۔ صبحِ زندگی	"	۱۹۴۴ء	"
۵۔ منازل السائرہ	"	۱۹۷۶ء	دفتر عصمت کراچی
۶۔ وداعِ ظفر	"	۱۹۸۷ء	اردو اکادمی دہلی
۷۔ بنت الوقت	"	۱۹۳۳ء	برقی پریس دہلی
۸۔ موٗودہ	"		اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور
۹۔ جوہر عصمت	"	۱۹۲۷ء	عصمت بک ڈپو دہلی
۱۰۔ قطراتِ اشک	"	۱۹۲۱ء	"
۱۱۔ طوفانِ اشک	"	۱۹۲۹ء	"
۱۲۔ غدر کی ماری شہزادیاں	"	۱۹۳۲ء	"
۱۳۔ دلی کی آخری بہار	"	۱۹۳۷ء	"
۱۴۔ یاسمین وشام	"	۱۹۳۱ء	"
۱۵۔ عروسِ کربلا	"	۱۹۳۳ء	"
۱۶۔ اردو کا پہلا افسانہ نگار راشد الخیری	مرزا حامد بیگ	۱۹۹۳ء	علامہ راشد الخیری اکادمی، صدر کراچی
۱۷۔ علامہ راشد الخیری تنقیدی مقالات	مرتبہ وقار عظیم	۱۹۴۵ء	دہلی

فہرست کتب	مصنف	سن اشاعت	مقام اشاعت
۱۸۔ بیسویں صدی میں اُردو ناول	ڈاکٹر یوسف سرمست	۱۹۷۳	ایجوکیشنل بک ڈپو، حیدرآباد (اے پی)
۱۹۔ اردو ناول: آزادی کے بعد	اسلم آزاد	۱۹۸۱ء	نکھار پریس، مئو
۲۰۔ ناول کی تاریخ و تنقید	علی عباس حسینی		انڈین بک ہاؤس، پاکستان
۲۱۔ اردو نثر کا فنی ارتقا	ڈاکٹر فرمان فتحپوری	۱۹۹۴ء	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
۲۲۔ رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری	سید لطیف حسین ادیب	۱۹۶۱ء	کل پاکستان انجمن ترقی اردو کراچی
۲۳۔ ہندوستانی مسلم خواتین کی جدید تعلیمی ترقی میں اردو ناولوں کا حصہ	ثمین ثمر فضل	۱۹۹۱ء	اے ون فوٹو اسٹیٹ دہلی
۲۴۔ اردو افسانہ تحقیق و تنقید	انوار احمد	۱۹۸۸ء	ناشر بیکن بکس، گلگشت، ملتان
۲۵۔ اُردو افسانہ سماجی و ثقافتی پس منظر	عزیز فاطمہ	۱۹۸۴ء	نامی پریس لکھنؤ
۲۶۔ داستان سے افسانے تک	وقار عظیم	۱۹۷۹ء	دہلی
۲۷۔ اردو افسانوں میں سماجی مسائل کی عکاسی	شکیل احمد	۱۹۸۴ء	آفسیٹ پریس، گورکھپور

فہرست کتب	مصنف	سن اشاعت	مقام اشاعت
۲۸۔ نیا افسانہ	وقار عظیم	۱۹۷۷ء	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ
۲۹۔ دہلی میں اردو افسانہ	ظلِ ہما		
۳۰۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ	قمر رئیس	۱۹۹۰ء	اردو اکادمی دہلی

رسائل:

فہرست کتب	مصنف	سن اشاعت	مقام اشاعت
۳۱۔ ماہنامۂ عصمت	رازق الخیری	جولائی ۱۹۶۴ء	دفتر عصمت، نئی دہلی
۳۲۔ عصمت راشد الخیری نمبر	"	۱۹۳۶ء	" "
۳۳۔ عصمت اگست	"	۱۹۶۴ء	" "
۳۴۔ عصمت گولڈن جوبلی نمبر	"	۱۹۵۸ء	راشد الخیری اکادمی، دفتر عصمت کراچی
۳۵۔ اردو زبان و ادب کا خاکہ	خوشحال زیدی	۱۹۸۹ء	بزمِ خضرِ راہ، نئی دہلی
۳۶۔ نقوش شخصیات نمبر	محمد طفیل	۱۹۵۵ء	ادارہ فروغِ اردو لاہور

اپنے موضوع پر ہندوستان اور پاکستان میں پہلا تحقیقی مقالہ ہے

جس پر

جامعہ ملّیہ اسلامیہ یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض کی

بچّوں کے ادب کا پہلا انسائیکلوپیڈیا

اُردو میں بچّوں کا ادب

مصنّفہ:
ڈاکٹر خوشحال زیدی

دستاویز تین مفصّل اور مکمّل حصوں میں منقسم ہے

پہلے حصّے میں: بچّوں کا ادب کیا ہے، بچّوں کے ادب کی ضروریات اور مسائل، بچوں کی نفسیات، ادبِ اطفال کے بنیادی عناصر، کہانی، ناول، ڈرامہ، غیر افسانوی ادب، معلوماتی ادب، سائنسی ادب، شاعری، گیت اور نظمیں، کھیل کے گیت، تیوہاروں کے گیت، لوریاں، پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، منظوم کہانیاں اور درسی کتب۔

دوسرے حصّے میں: اُردو ادبِ اطفال کا تاریخی ارتقا، بچّوں کا عالمی ادب، اُردو ادبِ اطفال کا دَورِ اوّل، امیر خسرو تا مرزا غالب اور دورِ دوم ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء اور دورِ سوم ۱۹۴۷ء تا حال کا مفصّل، مکمّل اور مدلّل جائزہ لیا گیا ہے۔

تیسرے حصّے میں: اردو ادبِ اطفال کا تخلیقی اصناف کا تجزیاتی مطالعہ جیسے اہم موضوعات پر تحقیقی اور تخلیقی مواد یکجا کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو بچّوں کے ادب کی پہلی اور واحد حوالہ جاتی کتاب تسلیم کیا گیا ہے۔ ضخامت: ۵۷۶ صفحات، سائز: ڈیمائی، قیمت: دو سو روپے۔

ادارہ بزمِ خضرِ راہ
۸۰۔ انتظار لاج، غفار منزل ایکسٹینشن، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵